ر ۱۷۷ ماہ ربیع الاول ۱۴۲۷ھ مطابق ماہ اپریل ۲۰۰۶ء عدد ۴

فہرست مضامین

ای میل: email: shibli_academy@rediffmail.com

مجلس ادارت

معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ۱۲۰ روپے فی شمارہ ۱۲ روپے

پاکستان میں سالانہ ۳۰۰ روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پچیس پونڈ یا چالیس ڈالر

بحری ڈاک نو پونڈ یا چودہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ:

حافظ سجاد الٰہی ۲۷/اے، مال گودام روڈ، لوہا مارکیٹ بادامی باغ، لاہور، پنجاب (پاکستان)

Mobile: 3004682752 — Phone: (009242) 7280916 5863609

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، چک بھیجنے کی صورت میں پچاس روپے مزید ارسال کریں، چک یا بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

☆ DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کی ۲۰ تاریخ تک رسالہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع اسی ماہ کی آخری تاریخ تک دفتر معارف میں ضرور پہنچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

☆ کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا، رقم پیشگی آنی چاہیے۔

پرنٹر، پبلیشر، ایڈیٹر۔ضیاء الدین اصلاحی نے معارف پریس میں چھپوا کر دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

شذرات

اسلام توحید خالص کا داعی ہے، وہ دنیا کو کفر وشرک کی تاریکیوں سے نکالنے اور ضلالت و گمراہی کو ختم کرنے کے لیے آیا ہے، اس کے نزدیک خدا کے سوا کسی کی پرستش جائز نہیں ہے، تمام انبیاء نے توحید کی دعوت اور شرک وبت پرستی سے اجتناب کی تعلیم دی ہے "يٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَيۡرُهٗ" خدا نے ان کی زبان سے کہلایا کہ "میں تو تمہاری ہی طرح کا ایک بشر ہوں (البتہ مجھے نبوت ورسالت سے سرفراز کیا گیا ہے) میری طرف وحی آتی ہے کہ تمہارا معبود بس ایک ہی معبود ہے، پس جو اپنے رب سے ملاقات کا متوقع ہو اسے چاہیے کہ نیک عمل کرے اور اپنے رب کی بندگی میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے"، خدا کا ارشاد ہے "کسی بشر کی یہ شان نہیں کہ اللہ اسے کتاب، حکم اور نبوت عطا فرمائے پھر وہ لوگوں سے یہ کہے کہ اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ بلکہ وہ یہ کہے گا کہ اللہ والے بنو کیوں کہ تم کتاب الٰہی کی تعلیم دیتے ہو اور خود بھی اس کو پڑھتے ہو، وہ تمہیں اس کا بھی حکم نہیں دے گا کہ فرشتوں اور نبیوں کو رب بناؤ، کیا وہ تمہیں کفر کا حکم دے گا بعد اس کے کہ تم خدا کے فرماں بردار ہو" مگر انسان کا حال یہ ہے کہ جس میں بھی عظمت اور بزرگی کا کوئی پہلو دیکھا، اسے اپنا معبود بنالیا اِتَّخَذُوۡۤا اَحۡبَارَهُمۡ وَرُهۡبَانَهُمۡ اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اور جس چیز میں نفع ونقصان کا کوئی اثر اسے نظر آیا تو اسے رب بنالیا، مشرک قوموں کا یہی شیوہ ہے۔

اشخاص کے معاملے میں انسانی فطرت عجیب واقع ہوئی ہے، آدمی کو جس سے عقیدت و محبت ہوتی ہے اور وہ اس سے خوش ہوتا اور اسے پسند کرتا ہے تو اسے مافوق البشر اور فرشتوں کی طرح معصوم سمجھ کر اس کی پوجا کرنے لگتا ہے اور اس کی محبت وعقیدت میں ایسا اندھا بہرا ہو جاتا ہے کہ اس کے خلاف کوئی بات سننا گوارا نہیں کرتا، غلطی اور کوتاہی سے کوئی انسان مبرا نہیں مگر کسی کو اپنی محبوب شخصیت میں اس کا شائبہ بھی نہیں دکھائی دیتا اور وہ اسے گناہوں سے دھلی ہوئی خیال کرتا ہے، اس کے برعکس جب کسی سے ناراض اور ناخوش ہوتا ہے تو اس سے شدید بغض ونفرت کرنے لگتا ہے، اس میں اسے خیر وخوبی کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا اور وہ اسے مجموعۂ عیوب سمجھ کر اس کے سب وشتم پر آمادہ ہو جاتا ہے، اشخاص کے معاملے میں یہ افراط وتفریط عام ہے، اس کی وجہ سے

لوگوں کو ان کے صحیح درجے اور مرتبے پر نہیں رکھا جاتا، یہیں سے شخصیت پرستی کی بنیاد پڑتی ہے اور لوگوں کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا، اسی کے پیش نظر مولانا حالی نے کہا ہے:

مگر مومنوں پر کشادہ ہیں راہیں — پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں
نبی کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں — اماموں کا رتبہ نبی سے بڑھائیں
نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے
نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جائے

عقیدت ومحبت کے غلو اور اشخاص کی عظمت اور بڑائی کے تصور کی بنا پر مقدس اور عظیم لوگوں کی اولاد اور ان سے نسبی تعلق رکھنے والوں کو بھی فائق وبرتر اور عام لوگوں سے ممتاز سمجھا جاتا ہے، حالانکہ یہ سراسر غیر اسلامی اور برہمنی تصور ہے، اسلام نے حسب ونسب اور عظیم ہستیوں سے تعلق کو معیار فضیلت ماننے کے بجائے زہد وورع اور ذاتی قابلیت وصلاحیت کو فضل وکمال کا معیار قرار دیا ہے، عام انسانوں کے مال وجائداد کے وارث ان کے اعزہ ہوتے ہیں لیکن فضل وکمال تو وہبی اور خداداد چیز ہے جو کسی خاندان میں ہونے کی وجہ سے نہیں ملتی، چنانچہ قیامت کے دن رشتے ناتے کام نہیں آئیں گے فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوۡرِ فَلَاۤ اَنۡسَابَ بَيۡنَهُمۡ لیکن انبیاء کے نہ مال واسباب میں وراثت چلتی ہے اور نہ قیامت کے روز ان سے رشتہ ناتہ کام آئے گا، آپؐ نے اپنے مرد رشتہ داروں کی طرح اپنی بیٹی اور پھوپھی کو بھی مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ قیامت میں تمہارے اعمال تمہارے کام آئیں گے، میرا رشتہ کام نہیں دے گا، اسلام کا اصول یہ ہے کہ انبیاء ہوں یا کسی منصب پر فائز لوگ ان کے جانشین وہی لوگ ہوں گے جو واقعی اہل، لائق اور صاحب صلاحیت ہوں گے، عہدے کسی کو موروثی طور پر نہیں ملیں گے جیسا کہ خاندانی بادشاہوں کے یہاں ہوتا ہے اور اب تو یہی تماشا جمہوری حکومتوں میں بھی ہو رہا ہے کہ نااہل اولاد اور رشتہ دار اپنے آبا کے جانشین بنا دیے جاتے ہیں۔

اسلام میں خلیفہ اور حکمراں کے انتخاب کا کوئی متعین اصول وضابطہ نہیں ہے، ان کا انتخاب ارباب حل وعقد کی رائے سے ہوتا ہے یا خود خلیفہ صائب الرائے لوگوں کے مشورے سے اس شخص کو منتخب کر دیتا ہے جو سب میں افضل ہوتا ہے، اسلام کا مثالی اور سب سے بہتر دور رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین کا تھا، آپؐ کی وفات کے بعد سب کے مشورے سے مجمع عام میں آپؐ کے

جانشین کا انتخاب ہوا تھا اور آپؐ کے اعزہ واقربا کے ہوتے ہوئے حضرت ابوبکرؓ خلیفہ مقرر کر لیے گئے تھے اور انہوں نے اپنی وفات کے وقت بعض صائب الرائے لوگوں کے مشورے سے حضرت عمرؓ کا انتخاب کیا تھا، بعد کے خلفا کا انتخاب بھی اسی طرح ہوا مگر ان میں سے کسی کا انتخاب بھی موروثی طور پر نہیں ہوا، حضرت عمرؓ کے سامنے ان کے بیٹے کا نام پیش ہوا تو انہوں نے اس کو رد کر دیا، اس مبارک دور میں جب سلطنت کا دائرہ وسیع ہوا اور نظم ونسق کے مختلف شعبے قائم ہوئے تو ان کے سربراہ بھی وہی لوگ چنے جاتے تھے جو اہل، لائق اور قابل ہوتے تھے اور کسی عہدہ ومنصب کے لیے خاندان اور قرابت داری کو بنیاد نہیں بنایا جاتا تھا مگر جب ملوکیت کا دور آیا تو لوگوں نے اپنی اولاد کو اپنا ولی عہد نامزد کرنا شروع کیا اور رشتہ داروں کو عہدے سپرد کرنے لگے۔

علوم وفنون کی ترقی کا دور شروع ہوا تو ہر علم وفن کے ماہرین وفضلا پیدا ہوئے جن کے مختلف طبقات قائم ہوگئے، علما واصحاب درس کے طبقے نے درس وتدریس کی مسند کو رونق بخشی اور پھر بہ تدریج تعلیمی مراکز اور مدارس قائم ہوئے، طبقہ صوفیہ ومشائخ اور عباد وزہاد نے نفوس انسانی کی تربیت وتزکیہ اور اعمال واخلاق کی اصلاح کی ذمہ داری سنبھالی، بعد میں ان کی زوایا اور خانقاہیں وجود میں آئیں، اس کے علاوہ قومی، ملی اور سیاسی ضرورتوں کے پیش نظر انجمنوں اور جماعتوں کی تشکیل بھی ہونے لگی مگر شروع میں ان تمام طبقوں اور گروہوں میں خالی جگہوں کو پر کرنے کے لیے اہلیت وصلاحیت دیکھی جاتی تھی اور کسی شخص کا انتخاب نہ نسلی ونسبی تعلق کی بنا پر ہوتا تھا اور نہ متوفی سے اس کے خاندانی تعلق کا کوئی لحاظ کیا جاتا تھا لیکن اب ان تمام مراکز اور اداروں میں اہلیت، تجربہ اور لیاقت وقابلیت کو دیکھنے کے بجائے ان لوگوں کو منتخب کیا جانے لگا ہے، جو تنظیم یا ادارے کے سربراہ کے رشتہ دار اور قریب ترین لوگ ہوتے ہیں، خواہ ان میں اہلیت اور تجربہ ہو یا نہ ہو حالانکہ ان اداروں میں فاضل اشخاص موجود ہوتے ہیں مگر چوں کہ وفات پانے والے کے خاندان سے ان کا تعلق نہیں ہوتا اس لیے ان کی جانب کسی کی نگاہ ہی نہیں اٹھتی، خانقاہوں میں سجادہ نشینی کے لیے بڑی اولاد اپنے آپ منصب پر فائز ہو جاتی ہے اور اس میں بالغ ونابالغ کی قید بھی ختم ہوگئی ہے، حالانکہ نابالغ بے چارہ تو احکام شرعیہ کا بھی مکلف نہیں ہوتا، اس کی وجہ سے اختلاف اور تفرقہ ہی نہیں مقدمے بازی بھی ہو رہی ہے، یہ سب عقیدت کے غلو کے برگ وبار ہیں۔

☆☆☆

مقالات

مذہب اور فلسفہ: مطابقت اور نزاع

علامہ ابن رشد کے حوالے سے

از:- پروفیسر الطاف احمد اعظمی☆

جب ہم تاریخ فلسفہ کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مذہب اور فلسفہ میں مطابقت اور عدم مطابقت کے بارے میں اختلاف رائے ہے، ایک گروہ کا خیال ہے کہ ان دونوں میں مطابقت ہے، اس گروہ میں فارابی (م ۹۵۰ء) اور ابن سینا (م ۱۰۳۷ء) شامل ہیں، دوسرا گروہ ان فلاسفہ کا ہے جو عدم مطابقت کے قائل ہیں، ان کا خیال ہے کہ مذہب اور فلسفہ کے علاقے الگ الگ ہیں، اس لیے ان دونوں کو مصنوعی طریقوں سے جمع کرنا صحیح نہ ہوگا، مشہور فلسفی الکندی (م ۸۷۳ء) اور بجستانی کا یہی نقطہ نظر تھا، اس معاملے میں ابن رشد (م ۱۱۹۸ء) کا تعلق پہلے گروہ سے ہے لیکن اس کا طریقہ استدلال اس گروہ سے تعلق رکھنے والے فلاسفہ سے مختلف ہے۔

ابن رشد کا خیال ہے کہ مذہب اور فلسفہ میں اصولی طور پر کوئی اختلاف نہیں ہے کیوں کہ دونوں کا مقصد ایک ہے، مذہب کا بنیادی مقصد حقیقت اعلا یعنی خدا کا عرفان ہے اور یہی فلسفہ کا بھی اصلی ہدف ہے (۱)، اس نے لکھا ہے: ”فلسفہ کا کام اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے کہ موجودات اور اس کے متعلقات پر اس حیثیت سے غور کیا جائے کہ وہ صانع کی طرف رہنما ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ جب صنعت کی معرفت حاصل ہوگئی تو صانع کی معرفت بھی بدرجۂ اتم حاصل ہوگئی“۔(۲)

مذہب اسلام نے بھی اہل علم کے لیے خدا کی معرفت کا یہی طریقہ بتایا ہے، یعنی نظام

☆ جامعہ ہمدرد، ہمدرد نگر، نئی دہلی۔

عالم پر غور و فکر کر کے اصل حقیقت تک رسائی حاصل کرنا، ابن رشد نے لکھا ہے: "شریعت نے موجودات پر عقل کے ذریعہ غور کرنے اور اس کے ذریعہ ان کی معرفت حاصل کرنے کی دعوت دی ہے اور یہ بات اللہ تبارک وتعالیٰ کی کتاب کی آیات سے بالکل واضح ہے، جیسا کہ اس نے فرمایا: اولم ینظروا فی ملکوت السموت و الارض وما خلق اللہ من شیٔ (سورہ اعراف: ۱۸۵)، یہ آیت تمام موجودات عالم پر غور کرنے کی ترغیب کے لیے ایک پختہ دلیل (نص) ہے"۔ (۳)

ابن رشد کا یہ بھی خیال ہے کہ شریعت نے موجودات عالم پر غور و فکر کی جو دعوت دی ہے اس کا سب سے اعلا ذریعہ عقل و منطق ہے، اس نے واضح لفظوں میں لکھا ہے کہ: "جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ شریعت نے موجودات اور اعتبار موجودات پر عقل کے ذریعہ غور کرنا واجب کر دیا ہے اور اعتبار اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے کہ معلوم سے مجہول کا استنباط اور استخراج کیا جائے جس کا نام قیاس بالقیاس ہے، تو اب یہ بھی واجب ہے کہ ہم موجودات میں قیاس عقلی کے ذریعہ غور کریں، یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ غور کرنے کی قسموں میں سب سے زیادہ مکمل اور قیاس کی قسموں میں سب سے زیادہ بہتر قیاس کا نام "برہان" ہے"۔ (۴)

لیکن ابن رشد کا یہ خیال پورے طور پر صحیح نہیں ہے، قرآن حکیم میں آثار و مظاہر کائنات پر غور و فکر کی جو دعوت دی گئی ہے، اس کا ذریعہ محض عقل اور اس کے متعلقات نہیں بلکہ دوسرے ذرائع بھی اس میں شامل ہیں، خود ابن رشد نے موجودات پر غور و فکر سے متعلق جو آیات نقل کی ہیں اور ان میں سے ایک آیت ہم اوپر نقل کر چکے ہیں، ان میں آیت ذیل سے ہمارے خیال کی تائید ہوتی ہے، فرمایا گیا ہے:

افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت ۔ والی السمآء کیف رفعت ۔ والی الجبال کیف نصبت ۔ والی الارض کیف سطحت (سورہ الغاشیہ: ۱۷-۱۹)

کیا وہ نہیں دیکھتے ہیں کہ برتہ بادل کیسے بنائے گئے اور آسمان کیسے بلند کیا گیا اور پہاڑ کیسے کھڑے کیے گئے اور زمین کیسے بچھائی گئی۔

اس آیت میں جو سوالات قایم کیے گئے ہیں، یعنی بادلوں کی تخلیق، آسمان (اجرام فلکی) کا فضا میں کسی ظاہری ستون کے بغیر قایم ہونا، زمین کا ہموار اور مسطح ہونا اور اس میں عظیم الجثہ

پہاڑوں کا میخوں کی طرح گڑا ہونا، ان کا جواب قیاس عقلی کے ذریعہ ممکن ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ ممکن نہیں ہے، ان کائناتی حقایق کا انکشاف گہرے مشاہدہ و تجربے کے ذریعہ ہی ممکن ہے اور یہ ذریعہ سائنسی علوم ہیں نہ کہ قیاسی علوم، اسی طرح قرآن مجید میں ایک جگہ ارشاد ہوا ہے:

قل سیروا فی الارض فانظروا کیف بدأ الخلق (سورہ عنکبوت: ۲۰)

ان سے کہو کہ زمین میں چل پھر کر دیکھیں کہ اس نے کس طرح تخلیق کی ابتدا کی۔

اس آیت کا تعلق بھی واضح طور پر مشاہدہ و تجربہ سے ہے، یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ قرآن مجید میں خدا اور اس کی صفات کا جو ذکر ہوا ہے وہ تمام تر نظری علم ہے اور یہ علم بھی انسانی زبان میں ہے جو بہر حال محدودیت رکھتی ہے لیکن عالم موجودات، جو حد درجہ مربوط اور منظم ہے، خدا کے وسیع اور ہمہ گیر علم کا عملی اظہار ہے، اس عالم فعل کی کلی تفہیم عقلی بحث و استدلال کے ذریعہ ممکن نہیں ہے، اس کے لیے تجربی علوم درکار ہیں، جن کو دوسرے مسلم فلاسفہ کی طرح ابن رشد نے بھی نظر انداز کیا ہے، اگر مسلمانوں نے آثار و مظاہر کائنات سے متعلق قرآن کی آیات میں غور و فکر کی نوعیت کو ٹھیک طور پر سمجھ لیا ہوتا تو وہ مدتوں فلسفہ و منطق کی فضول بحثوں میں اپنی گراں قدر علمی صلاحیتوں کے اتلاف سے بچ گئے ہوتے۔

اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ مابعد الطبیعیاتی مسائل میں جو مذہب اور قدیم فلسفہ دونوں میں اہم مسائل کی حیثیت رکھتے ہیں، کہاں تک اتحاد و موافقت ہے؟ امام غزالیؒ (م ۱۱۱۱ء) نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "تہافۃ الفلاسفہ" میں بیس ایسے مابعد الطبیعیاتی مسائل کا ذکر کیا ہے جو مذہب کی رو سے قابل اعتراض ہیں، ان میں سے مندرجہ ذیل مسائل قابل ذکر ہیں:

۱- عالم قدیم ہے۔ ۲- عالم، زمان اور حرکت سب ازلی ہیں۔ ۳- تخلیقِ کائنات اور خالق کائنات جیسے الفاظ حقیقی نہیں بلکہ اشاراتی مفہوم رکھتے ہیں۔ ۴- نفیِ صفات۔ ۵- خدا کی ذات بسیطِ محض بلاماہیت ہے۔ ۶- خدا کو جزئیات کا علم نہیں۔ ۷- افلاک کی ارواح کا ان تمام جزئی امور سے واقف ہونا جو اس کائنات میں رونما ہوتے ہیں۔ ۸- خرقِ عادت ناممکن ہے۔ ۹- حشرِ اجساد ممکن نہیں ہے۔ ۱۰- روح کی انفرادی بقا کا انکار۔

ان مسائل میں سے چار مسئلے ایسے ہیں جو ارباب مذہب کی نظر میں مذہبی تعلیمات

سے صریحاً متصادم ہیں اور وہ یہ ہیں: قدامتِ عالم، خرقِ عادت، حشرِ اجساد اور روح کی انفرادی بقا کا انکار اور ان ہی مسائل کی بنیاد پر امام غزالیؒ نے فارابی اور ابن سینا کی تکفیر کی ہے (۵)، ہم یہاں اپنی گفتگو صرف ان چار مسائل تک محدود رکھیں گے اور اس بات کا جائزہ لیں گے کہ ان مسائل کے بارے میں ابن رشد کے کیا خیالات تھے اور وہ کہاں تک مذہبی فکر سے ہم آہنگ ہیں۔

عالم حادث ہے یا قدیم؟

اس مسئلے میں خود یونانی فلاسفہ میں اختلاف ہے، افلاطون کی رائے ہے کہ نظامِ عالم حادث ہے، یعنی ایک خاص وقت میں اس کا ظہور ہوا ہے، اس سے پہلے وہ موجود نہیں تھا، افلاطون نے یہ بھی کہا ہے کہ حرکت منتظمہ بھی، جس سے زمانہ کا قیاس ہوتا ہے، حادث ہے، ارسطو کی رائے اس سے مختلف ہے، اس کے نزدیک عالم قدیم ہے اور زمانہ بھی قدیم ہے، جس کی ابتدا ایک طرف سے نہیں ہوئی اور نہ انتہا دوسری طرف ہوگی۔

ابن رشد نے اس معاملے میں ارسطو کی پیروی کی ہے لیکن مذہبی خیال کو بھی بالکلیہ رد نہیں کیا ہے، اس نے اس مسئلے کی توجیہ اس طور پر کی ہے کہ مذہب اور فلسفے میں مطابقت پیدا ہو، چنانچہ اس نے لکھا ہے کہ عالم مادی تین طرح کے موجودات پر مشتمل ہے: ۱- حسی موجودات، جو ایک مخصوص علت رکھتے ہیں، مثلاً پانی، ہوا، جانور اور نباتات وغیرہ اور اس معاملے میں اہل مذہب اور فلاسفہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے، ۲- غیر مرئی ہستی، جو اپنے وجود کے لیے کسی علت کی محتاج نہیں بلکہ واجب الوجود ہے اور یہ ازلی خدا ہے جو پہلے دو وجودوں سے مختلف ہے اور یہ خود عالم ہے، یہ اپنے وجود کے لیے نہ کسی علت کا مرہون ہے اور نہ ہی زمانہ اس سے مقدم ہے اور اس تیسرے وجود میں متکلمین اور حکمائے قدیم کا اختلاف ہے۔ (۶)

اس تیسرے وجود کا نام فلسفہ کی اصطلاح میں ''وسط'' اور اول الذکر دو موجودات ''طرفین'' کہلاتے ہیں، ''وسط'' یعنی عالم کی حقیقت واضح کرتے ہوئے ابن رشد نے لکھا ہے: ''ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ اس وجود (عالم) نے وجودِ حقیقی اور وجودِ قدیم کی ایک شباہت اور عکس کو پالیا ہے، جس شخص پر اس کا وہ حال غالب آگیا جہاں اس کے حدوث کی بہ نسبت قدم کی شباہت ہے تو اس نے اس عالم کا نام قدیم رکھ دیا اور جس شخص پر اس کے حدوث کی شباہت غالب آگئی، اس نے اس کا نام حادث رکھ دیا، اگرچہ وہ حقیقت میں حقیقی حادث نہیں ہے اور نہ حقیقی قدیم ہے، اس

لیے کہ محدث حقیقی فاسد ہے اور رہا قدیم حقیقی تو اس کے لیے علت نہیں''۔ (۷)

مشائین (ارسطو اور اس کے پیرو) کے نقطۂ نظر کے اثبات کے بعد ابن رشد نے مذہبی زاویۂ نظر سے بھی اس مسئلے کا جائزہ لیا ہے اور لکھا ہے: ''ظاہرِ شرع میں اگر جستجو کی جائے تو ایجادِ عالم (ابداع) کی خبر دینے والی آیتوں سے پتا چلتا ہے کہ عالم کی صورت محدث حقیقی ہے مگر نفس وجود و زماں دونوں طرف غیر منقطع ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وھو الذی خلق السموات والارض فی ستۃ ایام وکان عرشہ علی الماء (سورہ ہود:۷) ظاہر آیت سے بالکل واضح ہے کہ اس عالم کے وجود سے قبل وجود ہے اور وہ عرش اور پانی ہے اور اس زمانہ سے قبل زمانہ ہے، اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ثم استوی الی السماء وھی دخان (سورہ حم سجدہ:۱۱) اس آیت کا ظاہر بھی مقتضی ہے کہ اللہ تعالیٰ ''سماوات'' شئے سے پیدا کرتے ہیں اور دخان ہے جو سماوات سے پہلے موجود تھا''۔ (۸)

عالم کو قدیم ماننے کی صورت میں ثنویت (Dualism) کا الزام عاید ہوتا ہے لیکن فلاسفۂ مشائین اس کی توجیہ کرتے ہیں، جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، عالم کو قدیم ماننے کی وجہ ان کا یہ خیال ہے اور ابن رشد بھی اس خیال کا حامی تھا کہ عدم محال ہے، اس لیے عدم سے کوئی چیز پیدا نہیں ہوسکتی ہے، مشائین نے اپنے اس خیال کی بنیاد قانونِ تعلیل پر رکھی ہے، اس قانون کے مطابق تین باتوں کا ہونا ضروری ہے: ۱- معلول کی کوئی علت ہو، ۲- علت اپنے معلول سے جدا ہو، ۳- علت کے ساتھ معلول بھی موجود ہو، اس میں فصل ممکن نہیں ہے، اس قانونِ تعلیل کے مطابق جب کائنات نیست سے ہست ہوئی تو اس کی کوئی نہ کوئی علت ضرور موجود تھی، وہ علت مادی نہیں ہوسکتی کیوں کہ مادہ تو اس وقت موجود ہی نہیں تھا اور اگر یہ کہا جائے کہ خدا کا ارادہ اس کائنات کو ایک خاص لمحے میں معرضِ وجود میں لانے کا سبب تھا تو سوال پیدا ہوگا کہ خدا کے ارادے میں اس اچانک تبدیلی کی وجہ کیا تھی، یہ مفروضہ علت جس نے کائنات کی تخلیق کے لیے ایک مخصوص وقت پر خدا کے ارادے کو برانگیخت کیا، یقیناً خدا کے ارادے کے علاوہ کوئی اور چیز ہونی چاہیے کیوں کہ علت معلول سے جدا ہوتی ہے لیکن یہ بات بھی ناممکن الوقوع ہے کیوں کہ خدا کے سوا ابھی کوئی چیز موجود نہ تھی، یہ ساری بحث اس نتیجہ تک لے جاتی ہے کہ یا تو خدا کے سوا کوئی چیز

موجود ہی نہیں یا پھر یہ ہے کہ کائنات ازل سے موجود ہے اور یہی آخری بات صحیح ہے، پہلی بات اس لیے صحیح نہیں ہے کہ کائنات ہمارے سامنے موجود ہے، اس کا عدم محض خارج از بحث ہے''۔(۹)

متکلمین کے نزدیک قانون تعلیل میں کئی نقائص ہیں، امام غزالیؒ نے نظریۂ تعلیل پر اعتراضات کیے ہیں اور حدوث عالم کو خدا کے ارادۂ ازلی پر موقوف رکھا ہے، یعنی خدا کا ارادہ نہ کسی علت کا محتاج ہے اور نہ زمان و مکاں کا، خدا کے ارادے کے ساتھ ہی یہ سب چیزیں عدم سے وجود میں آجاتی ہیں، انہوں نے اس رائے کے حق میں قرآن کی اس آیت سے استدلال کیا ہے:

اِنما امرہٗ اِذآ اراد شيئا اَنۡ يَّقُولَ لهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ
(سورہ یٰس: ۸۲)

جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا حکم ایسا ہے کہ وہ اس چیز سے کہتا ہے کہ ہوجا پس وہ ہوجاتی ہے۔

مشائین کے قانون تعلیل پر مشہور جرمن فلسفی کانٹ نے بھی اعتراضات کیے ہیں اور لکھا ہے کہ کائنات میں بے شک قانون تعلیل جاری ہے لیکن خدا کا ارادہ اس قانون تعلیل سے باہر ہے کیوں کہ اس قانون کی تخلیق بھی تو اس کے ارادہ ہی نے کی ہے۔

مشائین کی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے تخلیق عالم کو علت و معلول کے قانون کی روشنی میں دیکھا اور خدا کے ارادۂ ازلی کی فعالیت کو بھول گئے، جس پر قانون تعلیل کا اطلاق نہیں ہوتا لیکن اس نقص کے باوجود مشائین کا نقطۂ نظر صداقت سے بالکل خالی نہیں ہے، متکلمین اس بات کو مانتے ہیں کہ خدا کی ذات کی طرح اس کی صفات بھی قدیم ہیں اور اس کا اطلاق اس کی صفت تخلیق پر بھی ہوگا، اس بناپر عالم کو قدیم ماننا ہوگا کیوں کہ معلول ہر حال میں علت کے تابع ہوتا ہے، عالم کو حادث ماننے کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا کی صفت تخلیق کو بھی حادث مانا جائے جو ممکن نہیں، یہاں کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس تصور میں ثنویت موجود ہے، یعنی خدا بھی قدیم ہے اور عالم بھی قدیم لیکن ایسا نہیں ہے، عالم کے قدیم ہونے کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ وہ بالذات قدیم ہے، بالذات قدیم تو خدا کی ذات ہے، عالم اس کی نسبت سے قدیم ہے، یعنی اس کی علت خدا کی قوت تخلیق ہے جو محرک اول ہے لیکن خدا کسی علت کے بغیر قدیم ہے۔

تخلیق عالم کا عمل خدا کے ارادۂ ازلی کے تابع ہے اور یہ ارادہ کسی علت کا محتاج نہیں

ہے، دوسرے لفظوں میں وہ کسی چیز کو عدم سے پیدا کرنے پر قادر ہے اور سارا عالم عدم ہی سے وجود میں آیا ہے، اسی بات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے عیسائی شدید قسم کی غلط فہمی میں پڑ گئے، معلوم ہے کہ عیسیٰ بن باپ کے پیدا ہوئے جو ایک غیر معمولی واقعہ تھا، عیسائیوں نے اس سے یہ غلط نتیجہ اخذ کرلیا کہ وہ خدا کے بیٹے ہیں (نعوذ باللہ) ان کے اس غلط خیال کی تردید میں فرمایا گیا ہے:

مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنۡ يَّتَّخِذَ مِنۡ وَّلَدٍ سُبۡحَانَهٗ اِذَا قَضٰى اَمۡرًا فَاِنَّمَا يَقُوۡلُ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ
(سورہ مریم: ۳۵)

اللہ کے شایان شان نہیں ہے کہ وہ کسی کو اولاد بنائے، وہ اس چیز سے بالکل پاک ہے، جب وہ کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو بس اس کو کہتا ہے کہ ہوجا اور وہ فوراً ہی ہوجاتا ہے۔

خدا کے ارادہ اور اس کے فعل تخلیق میں کوئی زمانی فصل حائل نہیں ہے، وہ ایک ساتھ ظہور میں آتا ہے، بالکل اس طرح جیسے سورج سے روشنی اور پھول سے خوش بو کا اخراج، معلوم ہوا کہ خدا کی حیات ابدی میں تخلیق عالم کوئی جداگانہ واقعہ نہیں جو کسی خاص وقت میں پیش آیا ہو بلکہ وہ ایک مربوط اور مسلسل تخلیقی عمل ہے اور اس کے وجود کے ساتھ موجود ہے، اس اعتبار سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ عالم تخلیق کی نہ کوئی ابتدا ہے اور نہ انتہا، یہ ازل سے بنتا اور بگڑتا، موجود ہوتا اور فنا ہوتا آیا ہے، خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اب تک کتنے عوالم وجود میں آئے اور پھر غار فنا میں روپوش ہوگئے، یہ سلسلۂ بود و نبود یوں ہی جاری رہے گا، دوسرے لفظوں میں خدا کا عمل تخلیق کبھی ختم نہ ہوگا، موجودہ عالم کو بھی ایک دن نیستی کے سمندر میں غرق ہونا ہے اور پھر ایک نئے عالم کی تخلیق ہوگی، جیسا کہ آیاتِ ذیل میں فرمایا گیا ہے:

يَوۡمَ نَطۡوِى السَّمَآءَ كَطَىِّ السِّجِلِّ لِلۡكُتُبِ كَمَا بَدَاۡنَاۤ اَوَّلَ خَلۡقٍ نُّعِيۡدُهٗ وَعۡدًا عَلَيۡنَا اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيۡنَ
(سورہ انبیاء: ۱۰۴)

جس دن ہم آسمانوں کو اس طرح لپیٹ دیں گے جس طرح لکھی ہوئی تحریریں (طومار میں) لپیٹ دی جاتی ہیں اور جس طرح ہم نے اول تخلیق کی ابتدا کی تھی اسی طرح (فنا کے بعد) دوبارہ تخلیق کا آغاز کریں گے، یہ ہمارے ذمہ وعدہ ہے اور ہم ضرور اس کو کریں گے''۔

یوم تبدلُ الارضُ غیرَ الارضِ و السماواتُ و برزوا للہِ الواحدِ القھار (سورہ ابراہیم:۴۸)

جس دن یہ زمین بدل دی جائے گی ایک دوسری زمین میں اور آسمان بھی اور سب لوگ ایک باجبروت اللہ کے سامنے پیش ہوں گے۔

جزئیات کا علم

کہا جاتا ہے کہ حکمائے متقدمین کے نزدیک خدا کو جزئیات کا علم نہیں، اس کو صرف اپنی ذات اور کلیات کا علم حاصل ہوتا ہے (۱۰)، امام غزالیؒ نے اس پر اعتراض کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ خدا کو کلیات کے ساتھ جزئیات کا بھی علم حاصل ہے، دوسرے لفظوں میں اس کا علم کلی بھی ہے اور جزئی بھی (۱۱)، ابن رشد نے حکمائے مشائین کے نقطۂ نظر کی تائید کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ابوحامد غزالی نے حکمائے مشائین کو غلط سمجھا ہے، انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ حکمائے مشائین کے نزدیک اللہ تعالیٰ کو جزئیات کا بالکل علم نہیں ہے جب کہ مشائین کی رائے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جزئیات کو ایسے علم سے جانتا ہے جو ہمارے علم جیسا نہیں ہے، ہمارا علم جزئی اشیا کے متعلق معلوم کے ذریعہ معلول ہے، لہٰذا وہ اس کے حدوث کے ساتھ حادث ہوتا ہے اور اس کے تغیر کے ساتھ متغیر ہو جاتا ہے لیکن اللہ سبحانہ کا علم وجود کے ساتھ اس کے مقابل ہے لہٰذا وہ معلوم کے لیے علت ہے، چنانچہ جس شخص نے دونوں علموں کو ایک دوسرے کے ساتھ مشابہ سمجھا، اس نے ایک دوسرے کا مقابل کرکے ان کے خواص کو ایک کر دیا اور یہ انتہائی جہالت ہے"۔ (۱۲)

ابن رشد نے مزید لکھا ہے: مشائین نے یہ کہیں نہیں لکھا ہے کہ اللہ سبحانہ کو جزئیات کا علم قدیم نہیں ہے، ان کی رائے صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو جزئیات کا علم اس جیسا نہیں جیسا کہ ہمیں ہے بلکہ کلیات کا علم بھی ویسا نہیں ہے، اس لیے کہ کلیات معلومہ بھی ہمارے نزدیک طبیعت موجودہ سے معلول ہیں، اس علم (ربانی) میں معاملہ بالکل برعکس ہے، اس لیے وہی بات درست ہے جس تک برہان اور دلیل عقلی نے پہنچایا ہے اور وہ یہ ہے کہ علم ربانی اس تعریف سے بری ہے کہ اسے کلی یا جزئی کہا جائے"۔ (۱۳)

اگر خدا کے علم کے بارے میں حکمائے مشائین کا یہی نقطۂ نظر تھا، جیسا کہ ابن رشد نے لکھا ہے تو اس معاملے میں مذہب (اسلام) اور فلسفہ میں کوئی نزاع نہیں ہے، مذہب کے مطابق خدا کو ہر چیز کا علم ہے، خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی اور خواہ وہ پوشیدہ ہو یا ظاہر، خدا کا وسیع علم کائنات

اور اس کی جملہ اشیا کا احاطہ کیے ہوئے ہے، قرآن میں فرمایا گیا ہے:

ھو الاوّلُ و الاخرُ و الظاھرُ و الباطنُ و ھو بکلِّ شیءٍ علیمٌ (سورہ حدید:۳)

وہی اول ہے، وہی آخر ہے، وہی ظاہر ہے وہی باطن ہے اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ خدا کا فعل علم، انسان کے فعل علم سے بالکل مختلف ہے، جیسا کہ درج ذیل آیت سے بالکل واضح ہے:

لیس کمثلہ شیءٌ وھو السمیعُ البصیرُ (سورہ شوریٰ:۱۱)

کوئی چیز اس کے مثل نہیں ہے اور وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ شریعت کا مقصود یہ نہیں ہے کہ خدا کے علم کی نوعیت کو بتایا جائے کہ وہ ناقابل ادراک ہے اور اس کو کلی اور جزئی کے خانوں میں تقسیم کیا جائے جیسا کہ اکثر متکلمین اسلام نے کیا ہے بلکہ مجرد یہ بتاتا ہے کہ خدا بندوں کے جملہ افعال و اعمال کی خبر رکھتا ہے، سب چیزیں اس کی نگاہ کے سامنے ہیں تاکہ ان کو تنبہ ہو اور وہ برے افعال کے ارتکاب سے گریز کریں۔

حشر اجساد اور بقائے روح

مشائین کے فلسفہ کی رو سے حشر اجساد ممکن نہیں ہے کیوں کہ ہست سے نیست ہو جانے کے بعد کسی چیز کا دوبارہ اعادہ اسی صورت میں ناممکن ہے، اس خیال کی بنیاد اس فلسفیانہ نظریے پر ہے کہ عدم سے کسی چیز کی تخلیق محال ہے، اسی طرح مشائین کا خیال ہے کہ روح غیر فانی ہے لیکن اس کا اطلاق کلی روح پر ہوگا، انفرادی روحیں فانی ہیں۔

اس سلسلے میں ابن رشد کے خیال میں ابہام ملتا ہے جو غالباً دیدہ و دانستہ رکھا گیا ہے، ہم مان کر چلتے ہیں کہ وہ روح کی انفرادی بقا کا قائل تھا لیکن اس کا خیال ہے کہ جسم وہ نہ ہوگا جو اس دنیا میں ہے یعنی بالکل مادی، کیوں کہ موجودہ مادی بدن کا دوبارہ اعادہ ناممکن ہے، یا تو نیا جسم بدلے ہوئے حالات کے مطابق بہت لطیف ہوگا یا موجودہ صورت سے بلند تر، اس لیے کہ اعادہ کا مطلب ایک زیادہ اونچا درجہ ہے۔ (۱۴)

متکلمین اس خیال کے خلاف ہیں اور اس کو غلط سمجھتے ہیں، کیوں کہ اس کو تسلیم کر لینے

کے معنی در اصل خدا کی طاقت وقدرت کی نفی کے ہیں، خدا اس بات پر قادر ہے کہ ارواح کو ان کے موجودہ بدنوں کے ساتھ اٹھائے اور جزا وسزا کے فیصلے کرے اور یقیناً ایسا ہی ہوگا۔ (۱۵)

متکلمین اسلام کا یہ خیال راقم سطور کی نظر میں صحیح نہیں ہے، نبی ﷺ سے ان کے مخاطب اول اکثر یہ سوال کرتے تھے کہ جب آدمی مرجائے گا اور وقت کے ساتھ اس کا بدن گل سڑ کر مٹی میں رل مل جائے گا تو پھر وہ دوبارہ کس طرح اٹھایا جائے گا؟ اس سوال کے جواب میں فرمایا گیا:

قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَ	کہتا ہے کہ کون ہڈیوں کو زندہ کرے گا جب
هِيَ رَمِيْمٌ قُلْ يُحْيِيْهَا	وہ بوسیدہ (ہوکر جزء خاک) ہو چکی ہوں گی،
الَّذِيْ اَنْشَاَهَا اَوَّلَ مَرَّةٍ	کہو کہ وہی ہستی ان کو دوبارہ زندگی دے گی
وَّهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ	جس نے پہلی بار ان کو خلق کیا، وہ ہر طرح
(سورہ یٰس: ۷۸، ۷۹)	کی خلقت کا وسیع علم رکھتا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ حشرِ اجساد تو ایک طے شدہ امر ہے لیکن یہ کس شکل وصورت میں ہوگا، اس کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے، البتہ اسی آیت میں "وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ" کا جملہ بتاتا ہے کہ خدا کی تخلیق کسی ایک صورت میں محدود نہیں ہے، وہ خلّاق ہے، اس کی تخلیق کے ان گنت رنگ وروپ ہیں، اس لیے نئی زندگی کا قالب موجودہ مادی قالب سے مختلف ہوسکتا ہے بلکہ اس کو مختلف ہونا چاہیے کہ وہ موجودہ زندگی سے بہر طور ایک برتر زندگی ہوگی، درج ذیل آیت سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے، فرمایا گیا ہے:

نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَ	ہم نے ہی تمہارے درمیان موت ٹھہرائی اور ہم
مَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ عَلٰى اَنْ	اس سے عاجز نہیں ہیں کہ تمہارے امثال (۱۶)
نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ وَنُنْشِئَكُمْ	(قوالب) کو بدل دیں اور تم کو ایک ایسی صورت
فِيْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (سورہ واقعہ: ۶۰، ۶۱)	میں بنادیں جس کا تم کو علم نہیں۔

البتہ مشائین کا یہ خیال محل نظر ہے کہ بقا صرف روح کلی کے لیے ہے، بعض اہل علم کا خیال ہے کہ ابن رشد بھی اس خیال کا حامی تھا (۱۷)، مذہب کی رو سے انفرادی روح کی بقا ضروری

ہے کیوں کہ اس کے بغیر افراد کے اعمال کی جزا وسزا کا مذہبی تصور بے معنی ہو جاتا ہے، قرآن سے روح کی انفرادی بقا کے خیال کی تائید ہوتی ہے، فرمایا گیا ہے:

وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى	تم ہمارے پاس تنہا تنہا آگئے بالکل اس طرح
كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ	جیسے ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا اور جو
مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ	چیزیں بھی ہم نے تم کو (دنیا کی زندگی میں)
(سورہ انعام: ۹۴)	عطا کی تھیں ان کو اپنے پیچھے چھوڑ آئے ہو۔

اکثر مسلم فلاسفہ نے جن میں ابن رشد بھی شامل ہے، کوشش کی ہے کہ جن مابعد الطبیعیاتی مسائل میں فلسفہ اور مذہب ہم آہنگ نہیں ہیں ان میں تطبیق پیدا کی جائے اور اختلاف کو رفع کیا جائے لیکن اس کوشش میں انہوں نے مذہب کے ساتھ انصاف نہیں کیا اور فلسفہ سے ان کی مرعوبیت صاف طور پر جھلکتی ہے۔

ان کے نزدیک اختلافی مسائل میں مذہب اور فلسفہ کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کی ایک ہی صورت ہے کہ فلسفہ کی روشنی میں مذہب کے نقطہ نظر کو سمجھا جائے اور اس کی ایک ایسی تاویل کی جائے کہ وہ منطقی "برہان" کے مطابق ہو جائے۔ ابن رشد فلسفہ اور مذہب میں جس نوع کی مطابقت کا خواہاں تھا، اس کی نوعیت بالکل اسی قسم کی ہے، وہ فلسفہ کو سچائی کی سب سے اعلا شکل خیال کرتا تھا (۱۸) اور سمجھتا تھا کہ اس کے برہانی نتائج ہمیشہ سچائی پر مبنی ہوتے ہیں۔ (۱۹)

ابن رشد نے اپنی کتاب "فصل المقال" میں لکھا ہے: "ہم مسلمانوں کی جماعت کو قطعی طور سے یہ معلوم ہے کہ شریعت میں جو کچھ وارد ہوا ہے مطالعۂ برہانی اس کے خلاف نہیں لے جاسکتا ہے، اس لیے کہ حق مخالف حق نہیں ہوتا بلکہ اس کی تصدیق کرتا ہے اور اس کی شہادت دیتا ہے، اگر برہانی نظر ہم کو ایک ایسی چیز تک پہنچا دے جو موجود ہے تو یہ موجود اس حال سے خالی نہیں ہوگا کہ یا تو شریعت میں اس کے متعلق سکوت ہوگا یا اس کا ذکر ہوگا، اگر سکوت ہے تو اس سے یہاں بحث نہیں اور اس کا وہی مرتبہ ہے جس کے متعلق احکام نہ ہوں اور اسے فقیہ قیاس شرعی سے استنباط کرتا ہے۔ اگر شریعت میں اس کا ذکر ہے تو اس حال سے خالی نہیں ہوگا کہ یا تو ظاہر بیان برہانی نتیجہ کے موافق ہوگا یا مخالف، اگر موافق ہے تو پھر کسی بحث کی کوئی ضرورت نہیں اور اگر مخالف ہے تو اس

وقت تاویل کی ضرورت ہوگی"۔ (۲۰)

اور یہ تاویل قیاس برہانی کی روشنی میں کی جائے گی، ابن رشد لکھتا ہے: "ہم یہ قطعی طور پر کہتے ہیں کہ اس بات تک برہان نے پہنچایا ہو اور ظاہر شرع نے اس کی مخالفت کی ہو تو یہ ظاہر عربی قانون تاویل کے موافق تاویل قبول کرے گا...... بلکہ ہم یہاں تک کہتے ہیں کہ ظاہر شرع اگر برہانی تاویل کے خلاف ہے تو شرع اور اس کے اجزا کی چھان بین کرنے پر اس کے الفاظ میں بھی وہی پایا جائے گا جس کی بہ وجہ تاویل ظاہراً شہادت دی گئی ہے"۔ (۲۱)

اہل فلسفہ کے اس طریقہ تاویل کو درست تسلیم کرنے کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم یہ مانیں کہ فلسفہ ہی سچائی تک پہنچنے کا سب سے معتبر ذریعہ ہے اور قیاس برہانی سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ شک وشبہ سے بالاتر ہے اور یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ قرآن سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ غیر واضح اور غیر قطعی ہے، ابن رشد نے صاف لفظوں میں لکھا ہے کہ خدا کے کلام میں تاویل ہے۔ (۲۲)

ابن رشد کا یہ خیال صحیح نہیں ہے اور قرآن میں قلت تدبر کی دلیل ہے، قرآن کا حصہ محکمات اپنے معنی ومفہوم میں بالکل واضح اور قطعی الدلالت ہے، اس کی ہر آیت کا ایک ہی مدلول ہے کیونکہ ایک سے زیادہ مدلول ہونے کی صورت میں کلام کو واضح اور مبین نہیں کہا جائے گا، بلاشبہ ایجاز بیان کی وجہ سے قرآن کی متعدد آیات میں اجمال موجود ہے لیکن اس اجمال کی شرح کا حق نہ کسی فلسفی کو حاصل ہے اور نہ کسی بڑے سے بڑے عالم دین کو، قرآن کے ان تمام اجمالات کی شرح وتفصیل خود اللہ نے فرمادی ہے جو ہدایت کے نقطۂ نظر سے طالبِ وضاحت تھے، جیسا کہ اس کا ارشاد ہے:

ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (سورہ قیامہ:۱۹) پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اس کی تفصیل۔

ایک دوسری آیت میں فرمایا ہے:

الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ (سورہ ہود:۱) الرا، یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیات محکم ہیں (یعنی ان میں حد درجہ ایجاز ہے) پھر ایک حکیم وخبیر ہستی کی طرف سے ان کی تفصیل کی گئی ہے۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ اگر کسی مقام پر کوئی معنوی ابہام ہے تو اس کی وضاحت

دوسرے مقام پر مماثل آیات کے ذریعہ کی گئی ہے، اس منہج توضیح کو قرآن میں "تصریف آیات" کہا گیا ہے، مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے:

اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ (سورہ انعام:۶۵) دیکھو! ہم کس کس طرح اپنی آیتیں مختلف پہلوؤں سے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ بات کو سمجھ لیں۔

تصریف آیات کی حدود سے باہر جاکر کسی آیت کی عقلی تاویل جائز نہیں ہے، رہا قرآن کا حصہ متشابہات اور زیادہ تر اختلافات اسی حصے کی تاویل سے تعلق رکھتے ہیں، تو قرآن نے اس باب میں جس قدر وضاحت کردی ہے اس پر اکتفا لازمی ہے کہ ان کی صحیح حقیقت کا علم خدا کے سوا اور کسی کو نہیں ہے (۲۳)، اس معاملے میں بہت زیادہ عقلی کاوش مفید کے بجائے مضر ہے، اب تو یہ بات بالکل ثابت ہوچکی ہے کہ عقل اپنے عمل میں محدودیت رکھتی ہے، اس لیے مابعد الطبیعیاتی مسائل کے حل میں اس کے فیصلوں کو سند کی حیثیت حاصل نہیں ہے، کانٹ نے اپنی مشہور کتاب Critique of Pure Reason میں محکم دلائل سے ثابت کیا ہے کہ حقیقتِ مطلق کی تفہیم میں عقل، جیسا کہ پہلے گمان کیا گیا تھا، ایک قابل اعتماد ذریعہ نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ فلسفہ کے برخلاف مذہب، اگر وہ سچا اور غیر محرف ہے، خدا اور اس کی صفات اور دیگر مابعد الطبیعیاتی مسائل کی تفہیم میں سب سے معتبر ذریعہ ہے، مذہب، جیسا کہ اہل فلسفہ کا خیال ہے، محض اندھے اعتقاد اور غیر عقلی اطاعت کا نام نہیں ہے اور نہ ہی اس کے علم کی سطح کسی اور ذریعہ علم سے پست وفروتر ہے (۲۴)، وحی، جو سچے مذہب کا مصدر وماخذ ہے، عقل سے برتر اور اس سے کہیں زیادہ معتبر ذریعہ علم ہے (۲۵)، اس لیے مذہب کو فلسفہ سے مطابقت اور مابعد الطبیعیاتی امور میں اس کی رہنمائی کی مطلق ضرورت نہیں ہے بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے، یہاں میں Bonaventure Franciscan کے الفاظ مستعار لوں گا اور اپنی بات اسی پر ختم کروں گا:

" Philosophy needs the guidance of faith: far from being self sufficient, it is but a stage toward the higher knowledge that cuiminates in the vision of God."

''فلسفہ عقیدے کی رہنمائی کا محتاج ہے، اس لیے کہ وہ خود مکتفی نہیں ہے نامکمل ہے، اس کے برخلاف عقیدہ ایک برتر درجے کا علم ہے، جو بالآخر خدا کے عرفان تک لے جاتا ہے''۔ (۲۶)

مآخذ و حواشی

(۱) جدید فلسفہ کا رخ مابعد الطبیعیاتی مسائل کے بجائے عالم طبیعی کی طرف ہوگیا ہے اور اس کی وجہ بالکل واضح ہے، یورپ میں نشأۃ ثانیہ کا آغاز مذہب مخالف رجحانات کے تحت ہوا، اس لیے مابعد الطبیعیاتی مسائل سے فلسفہ کی عدم دل چسپی بلکہ مخاصمت ناگزیر تھی، اب عقیدے کی جگہ عقل (Reason) نے لے لی، جدید فلسفہ نے اپنی ترجیحات میں انسان، سول سوسائٹی اور نظام فطرت کو اہم جگہ دی اور ان ہی امور ثلاثہ سے متعلق مسائل اس کی بنیادی فکری حیثیت سے زیر بحث آئے ہیں۔ (۲) الکتاب فصل المقال، علامہ ابن رشد، اردو ترجمہ: عبید اللہ قدسی، اقبال ریویو، جنوری ۱۹۶۸ء، ص ۱۲۔ (۳) ایضاً۔ (۴) ایضاً، ص ۱۳۔ (۵) تہافۃ الفلاسفہ، امام غزالی، مطبع مصطفی البابی الحلبی مصر، ص ۹۱۔ (۶) فصل المقال، ص ۲۳، ۲۴۔ (۷) ایضاً۔ (۸) ایضاً، ص ۲۵۔ (۹) ایضاً، مزید دیکھیں: مختصر اردو دائرہ معارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب، لاہور ۱۹۹۷ء، (مضمون: ابن رشد) ص ۳۹۔ (۱۰) تہافۃ الفلاسفہ، ص ۵۲، ۵۳۔ (۱۱) ایضاً، ص ۵۳-۵۶۔ (۱۲) فصل المقال، ص ۲۲۔ (۱۳) ایضاً، ص ۲۳۔ (۱۴) انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، لیڈن ۱۹۲۷ء، (مضمون: ابن رشد)، ج ۲، ص ۴۱۲۔ (۱۵) تہافۃ الفلاسفہ، ص ۸۱-۹۱۔ (۱۶) اکثر مفسرین نے ''انشا لکم'' کا ترجمہ صحیح نہیں کیا ہے، مثلاً مولانا اشرف علی تھانویؒ نے لکھا ہے: ''تمہاری جگہ تمہارے جیسے اور (آدمی) پیدا کردیں''، (سورہ واقعہ: ۶۱)۔ (۱۷) انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، ج ۲، ص ۴۱۲۔ (۱۸) ہسٹری آف فلاسفی ان اسلام، پروفیسر ٹی۔ جے۔ ڈی بوئر، انگریزی ترجمہ: ایڈورڈ آر جونس بی ڈی، لندن ۱۹۶۵ء، ص ۱۹۹۔ (۱۹) انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا، ج ۱۷، ص ۷۴۹۔ (۲۰) فصل المقال، ص ۱۹۔ (۲۱) ایضاً۔ (۲۲) ایضاً، ص ۲۲۔ (۲۳) دیکھیں: سورۂ آل عمران: ۷۔ (۲۴) ہسٹری آف فلاسفی ان اسلام، ص ۱۶۸۔ (۲۵) ''یہ (قرآن) ایک کتاب ہے جسے ہم نے تم پر نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کو ان کے پروردگار کے حکم سے تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاؤ، غالب اور قابل تعریف خدا کے راستے کی طرف'' (سورہ ابراہیم: ۱)۔ (۲۶) دی نیو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (مائیکروپیڈیا)، ۱۹۷۴ء، ج ۱۴، ص ۲۵۹۔

دوشنبہ - ۱۲ ربیع الاول - حیات نبوی ﷺ کا انقلاب آفریں مرحلہ

از:- ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی ☆

''سیرت نبوی مقالہ نگار کی بحث و تحقیق کا خاص موضوع ہے اور اس پر انہوں نے بہ کثرت مقالے سپرد قلم کیے ہیں جن کے متعدد مجموعے طبع ہوچکے ہیں لیکن رائے عام سے مرعوبیت بھی عجیب چیز ہے، اس مضمون میں رسول اکرم ﷺ کے بعض واقعات زندگی کو دن اور تاریخ سے وابستہ کرنے کی کوشش میں وہ خوش اعتقادی کے حدود میں جا پہنچے ہیں، ولادت کا دن دوشنبہ چاہے مسلم ہو مگر ۱۲ ربیع الاول کی قطعیت میں ان کا انحصار کتب حدیث کے بجائے کتب سیر کی روایتوں اور اقوال جمہور پر ہے، تقویم کے حساب میں اگر غلطی کا امکان ہے تو کس چیز میں نہیں ہے مگر اس کی وجہ اور بنیاد تو ہونی چاہیے''۔ (معارف)

رسول اکرم ﷺ کی حیات طیبہ میں بعض دنوں اور بعض تاریخوں کی ایک خاص اہمیت ہے، دنوں میں دوشنبہ / پیر اور تاریخوں میں بارہ ربیع الاول کو دوسروں پر فضیلت حاصل ہے، ان کی متعدد وجوہ ہیں، دراصل ان سے حیات بابرکات کے بعض اہم واقعات وابستہ ہیں، کہا جاسکتا ہے کہ وہ سیرت نبوی کے عہد ساز اور انقلاب انگیز موڑ ہیں، حکمت الٰہی نے جب تخلیق کائنات کے وقت زمان و وقت کی مدت سال کے بارہ مہینوں میں متعین کی تھی (قرآن مجید، سورہ توبہ: ۳۶) تو ان میں سے چار مہینوں کو ''محرم و مقدس'' قرار دے کر اپنی حکمت واضح کردی تھی، یہ حکمت اس کے سوا اور کچھ نہ تھی کہ بیت اللہ کے حج و عمرہ کو آنے والے زائرین کے لیے امن و امان کا ماحول مہیا کیا جائے تاکہ وہ خطرات و مہلکات سے گھرے زمانوں کے بیچ بلا خوف و خطر سفر کرسکیں۔

☆ ڈائرکٹر شاہ ولی اللہ دہلوی ریسرچ سیل، ادارہ علوم اسلامیہ، مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ۔

تخلیق آدم وآفرینش کائنات کے دن وتاریخ کی ایک خاص حیثیت ہے، اسی سنت الٰہی کے مطابق رسول اکرم حضرت محمد بن عبد اللہ ہاشمی ﷺ کی مبارک زندگی کے بہت سے واقعات، حوادث اور معاملات کی خاص خاص تاریخیں اور ایام ہیں، بالکل اسی طرح جس طرح بہت سے اسلامی احکام اور الٰہی فرامین کی بجا آوری کے لیے خاص دن اور مخصوص تاریخیں متعین کی گئی ہیں، فرض روزوں کے لیے ماہ رمضان (سورہ بقرہ: ۱۸۵) اور حج کے لیے چند ماہ کی تخصیص (سورہ بقرہ: ۱۹۷) اور خاص ایام حج کے پانچ دنوں (۸-۱۲/ ذوالحجہ) کی تعیین اسی سنت الٰہی کے مطابق اور حکمت الٰہی سے وابستہ ہے، رسول اکرم ﷺ کی حیات طیبہ میں دوشنبہ یا پیر اور بارہ ربیع الاول کی خاص حیثیت ومنزلت سنت وحکمت الٰہی کے عین مطابق ہے۔

دوشنبہ/ پیر کی اہمیت یہ صرف حسن اتفاق نہیں کہ رسول اکرم ﷺ کی مبارک زندگی میں دوشنبہ بارہ ربیع الاول کا اجتماع کئی واقعات وحوادث کے حوالے سے پایا جاتا ہے جسے قران السعدین بھی کہا جا سکتا ہے، ایک مجموعۂ احادیث کے مطابق حضور سرور کائنات ﷺ کی بابرکات حیات کے چار اہم ترین واقعات -کم از کم- ان دونوں کے اجتماع سے وابستہ ہیں، رسول اکرم ﷺ نے اپنی زبان مبارک سے بہ نفس نفیس فرمایا کہ ”میں دوشنبہ کو پیدا ہوا، دوشنبہ کو ہی نبی بنایا گیا، اسی دوشنبہ کو میں نے ہجرت کی اور اسی دوشنبہ کو انشاء اللہ میری وفات بھی ہوگی“، (ابن اسحاق/ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، عبد الرحمن سہیلی، الروض الانف، دوم، ۳۸۵: کے مطابق رسول اکرم ﷺ نے حضرت بلال حبشیؓ سے فرمایا تھا: ”لا یفتک صیام یوم الاثنین: فانی قد ولدت فیه، و بعثت فیه، و اموت فیه“- تم سے دوشنبہ کے روزے فوت نہ ہوں کیوں کہ اسی دن میں پیدا ہوا اور اسی دن میں مبعوث ہوا اور اسی دن میری وفات بھی ہوگی“، مسعود احمد، صحیح تاریخ الاسلام والمسلمین، دہلی ۱۹۸۶ء، ۱۰۰، ۱۶۱، ۵۹۹ بالترتیب، بحوالہ صحیحین ولادت، بعثت، ہجرت اور وفات نبوی کے لیے دوشنبہ/ پیر کا ذکر کیا ہے، اگرچہ تاریخ کہیں نہیں دی ہے) امام ابن کثیر نے ایک اور روایت بیان کی ہے جو ابو بکر بن ابی شیبہ کی ہے اور اولین راوی حضرات جابر اور ابن عباسؓ ہیں: ”ولد رسول اللہ ﷺ عام الفیل یوم الاثنین الثانی عشر من ربیع الاول، وفیه بعث، وفیه عرج به الی السماء، وفیه ھاجر، وفیه مات“ (ابن کثیر، ۳/ ۱۰۹)

امام موصوف نے اگرچہ یہ نقد کیا ہے کہ اس روایت میں انقطاع ہے تاہم حافظ عبد الغنی مقدسی نے اپنی سیرت میں اس روایت کو لیا ہے، بہرحال اس روایت سے ایک اور واقعہ نبوی کے اسی دن اور اسی تاریخ میں وقوع پذیر ہونے کی بات سامنے آتی ہے اور وہ ہے آپ کی معراج واسراء جو ولادت، بعثت، ہجرت ووفات کے علاوہ ہے، جیسا کہ ابن اسحاق وغیرہ کی روایت میں آیا۔

ابن اسحاق کی اس روایت میں آپ ﷺ کی ہجرت مدینہ کا حوالہ یا ذکر نہیں ہے جس طرح امام مسلم بن حجاج قشیریؒ کی صحیح مسلم کی حدیث میں ہجرت ووفات کا ذکر نہیں، صرف ولادت و بعثت یا تنزیل وحی کا ذکر ہے (المنہاج فی شرح صحیح مسلم للامام النووی، مرتبہ ڈاکٹر وہبۃ الزحیلی، ہفتم ۲۳۵، حدیث نمبر ۱۹۸) کتاب الصیام، باب استحباب صیام ثلاثة ایام من الشهر و یوم عاشورا والاثنین: ...... عن ابی قتادة الانصاریؓ أن رسول اللہ ﷺ سُئِل عن صوم الاثنین فقال: فیه ولدت وفیه انزل علَی ...... ، امام نووی نے اپنی اسی شرح صحیح مسلم میں قاضی عیاض یحصبی کی تشریح حدیث یوں نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دوشنبہ کے دن روزہ رکھنے کی ایک وجہ یہ بتائی کہ ”اسی دن میں پیدا ہوا اور اسی دن میں مبعوث ہوا یا مجھ پر وحی نازل کی گئی“۔

...... یہ سب دوشنبہ کے دن ہوا تھا جیسا کہ دوشنبہ سے وابستہ بہت سی باقی روایات میں ذکر خیر آیا ہے، مرتب گرامی نے اپنے حاشیہ ایک میں امام احمد بن حنبل اور امام ابوداؤد کی روایات کا مختصر حوالہ دے کر اضافہ کیا ہے کہ بعض میں آپ کی وفات کا حوالہ بھی موجود ہے جو مسلم کی روایت پر اضافہ ہے، امام ابوداؤد کی سنن کی روایت میں دوشنبہ کو روزے رکھنے کی سنت وحکمت نبوی کا تو ذکر ہے مگر آپ ﷺ کی ولادت و بعثت یا ہجرت ووفات کا حوالہ نہیں ہے (مطبع قادری، دہلی ۱۲۷۱ھ، اول ۳۳۱: کتاب الصیام، باب من قال الاثنین والخمیس) سنن ابی داؤد کی دو شروح کے مولفین کرام مولانا فخر الحسن گنگوہی اور مولانا خلیل احمد سہارن پوری نے بھی اپنی تعلیقات یا حواشی میں ان واقعات سیرت کا حوالہ دیا ہے اور نہ امام مسلم وامام احمد وغیرہ کی روایات واحادیث کا (حاشیہ التعلیق المحمود)، مطبع نامی کان پور غیر مورخہ ۳۳۲، بذل المجهود فی حل ابی داؤد، مطبع نامی میرٹھ غیر مورخہ بالترتیب۔

مسند امام احمد بن حنبل میں دوشنبہ کے روزے رکھنے کی سنت سے متعلق چار احادیث ہیں جن میں رسول اکرم ﷺ اور آپ کے بعض اصحاب کرام کے اس دن روزہ رکھنے کے معمول کا ذکر ہے اور اس کی وجہ بتائی گئی ہے، حکمت یہ تھی کہ دوشنبہ کو انسان کے اعمال رب العالمین کی جناب میں پیش کیے جاتے ہیں اور رسول اکرم ﷺ کی تمنا تھی کہ جب آپ کا دفتر عمل پیش ہو تو آپ کے روزہ دار ہونے کا اس میں ذکر ہو، حضرت اسامہ بن زیدؓ بھی اس لیے روزہ اپنے بڑھاپے میں بھی رکھتے رہے، یہ احادیث بالترتیب حضرت اسامہ، ان کے غلام، حضرت ابوہریرہ اور حضرت عائشہ ؓ سے مروی ہیں۔ (احمد عبدالرحمن البنا الساعاتی، الفتح الربانی لترتیب مسند الامام احمد بن حنبل الشیبانی، مصر ۱۳۵۷ھ، دہم، ۲۸-۲۲۵)

لیکن مسند میں جو حدیث نبوی حضرت ابوقتادہ انصاریؓ سے مروی ہے، اس میں رسول اکرم ﷺ کی ولادت وبعثت یا آپ پر تنزیل وحی کا ذکر ہے اور الفاظ مذکورہ بالا حدیث مسلم کے مطابق ہی ہیں، مرتب گرامی نے امام نووی کی تشریح بھی اپنے حاشیہ میں نقل کردی ہے، البتہ یہ اضافہ کیا ہے کہ دوشنبہ کو آپ ﷺ کی ولادت اور آپ پر نزول قرآن کریم ہوا، اس لیے اس دن کی ایک شان ہے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ اس دن طاعت الٰہی میں سعی بلیغ کی جائے اور مولائے کائنات کی نعمت کے اتمام کا شکر ادا کیا جائے کہ اس نے نبی ﷺ کی ولادت (ایجاد) اور قرآن کریم کی تنزیل کی نعمت - بلکہ دو دو نعمتیں - ہمیں عطا فرمائیں۔ (الفتح الربانی، ج دہم، ۱۶۱: باب جامع بعض ما یستحب صومه وما یکره)

امام بخاری نے اگرچہ دوشنبہ کے روزے سے متعلق احادیث کو اپنی جامع صحیح میں جگہ نہیں دی ہے کہ وہ ان کی شرط پر پوری نہیں اترتیں، تاہم حافظ ابن حجر عسقلانی نے اپنی شرح بخاری میں وضاحت کی ہے کہ دوشنبہ کے روزوں سے متعلق متعدد صحیح احادیث وارد ہوئی ہیں، ان کو ابوداؤد، ترمذی، نسائی نے حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے اور اس کی تصحیح ابن حبان نے کی ہے، حضرت اسامہ کی جس حدیث میں دوشنبہ کو اعمال پیش کیے جانے کا ذکر ہے اس کو بھی نسائی اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ نے اس کو صحیح بتایا ہے، موخر الذکر امام نے حدیث عائشہ مذکورہ بالا کو بھی نقل کیا ہے۔ (فتح الباری، دارالسلام ریاض، ۱۹۹۷ء، چہارم، ۳۰۰:

كتاب الصوم، ٦٤ - باب هل يخص شيئا من الايام ؟)

امام ترمذی نے امام مسلم وامام احمد کی مانند دوشنبہ کے روزے سے متعلق حدیث حضرت عائشہؓ غیرہ نقل کی ہے جس میں اس کی یہ حکمت بیان کی گئی ہے کہ اس دن اعمال اللہ تعالیٰ کی جناب میں پیش کیے جاتے ہیں (جامع ابواب الصیام، باب ماجاء فی صوم یوم الاثنین والخمیس، مطبع مجتبائی، دہلی غیر مورخہ اول، ۹۳، محمد عبدالرحمن مبارک پوری، تحفۃ الاحوذی، منوناتھ بھنجن غیر مورخہ، سوم ۷۵-۳۷۴) امام ترمذی اور ان کے شارح مبارک پوری نے اعمال کے پیش کیے جانے کی حکمت تو بیان کی ہے مگر سیرت نبوی کے واقعات، ولادت، بعثت یا ہجرت ووفات کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے، امام نسائی نے ہر ماہ تین روزوں کی سنت کے بیان میں دوشنبہ کے روزے کا حوالہ ضرور دیا ہے مگر مزید معلومات نہیں فراہم کی ہیں۔ (سنن النسائی بشرح السیوطی وحاشیۃ السندی، كتاب الصيام، كيف يصوم ثلاثة ايام من كل شهر ...... مصر، سوم، ۲۱-۲۲۰)

عہد جدید کے ایک عالم حدیث اور سیرت نگار ڈاکٹر اکرم ضیاء عمری نے رسول اکرم ﷺ کی ایک سیرت لکھی ہے، جس کے متعلق ان کا دعویٰ ہے کہ وہ محدثین کرام کے طریقۂ حدیث کے مطابق صرف صحیح احادیث وروایات پر مبنی ہے، انہوں نے ولادت نبوی کے باب میں صحیح مسلم، سنن ابوداؤد اور مسند احمد کی مذکورہ بالا احادیث نبوی کی بنا پر لکھا ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی ولادت کا دن دوشنبہ؍پیر ہے اور مستدرک حاکم اور سیرت ابن ہشام کی روایات کی بنا پر سنہ عام الفیل بتایا ہے لیکن حیرت کی بات ہے کہ انہوں نے ماہ ربیع الاول کا بھی حوالہ نہیں دیا حالاں کہ اس کا ذکر متعدد محدثین نے کیا ہے، انہوں نے ولادت نبوی کی کوئی تاریخ بھی نہیں دی ہے۔ (السیرۃ النبویۃ الصحیحۃ، قطر ۱۹۹۱ء، ۹۸)

ولادت نبوی: دوشنبہ ۱۲؍ربیع الاول

ایک اہم امام حدیث جو سیرت نگار بھی ہیں، حافظ ابن سید الناس (محمد بن عبداللہ م ۷۳۴ھ؍۱۳۳۴ء) نے بڑے جزم کے ساتھ یہ بیان دیا ہے کہ "ہمارے سردار اور ہمارے نبی محمد رسول اللہ ﷺ دوشنبہ ۱۲؍ربیع الاول عام الفیل کو پیدا ہوئے:

وولد سيدنا ونبينا محمد رسول الله ﷺ يوم الاثنين لاثنتي عشرة ليلة

مضت من شهر ربيع الاول عام الفيل ...... (عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر، بیروت، ۱۹۸۶ء، اول، ۳۹ومابعد) اس کے بعد انہوں نے متعدد تاریخیں دی ہیں جو مختلف اقوال کے مطابق ولادت نبوی کے باب میں آئی ہیں لیکن ان سب کو انہوں نے مرجوح اور غیر معتمد قرار دیا ہے، دوسری تاریخیں دو طرح کی ہیں: ایک قسم کا تعلق ماہ ربیع الاول ہی سے ہے لیکن وہ بارہ ربیع الاول کے سوا ہیں جیسے ۲/۸/۹/وغیرہ اور بعض کا ربیع الاول کے علاوہ دوسرے کسی ماہ سے تعلق ہے، وہ ظاہر ہے کہ غلط ہیں کیوں کہ احادیث وسیر کے علما و ماہرین و محققین کا اب اس پر اتفاق واجماع ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی ولادت مبارکہ ماہ ربیع الاول میں ہوئی تھی اور ۱۲/ربیع الاول کو ہوئی تھی// بارہ ربیع الاول کے سوا جو تاریخیں بیان کی جاتی ہیں ان میں سے بعض روایات پر مبنی ہیں اور بعض کو تقویمی حساب کی بنا پر اختیار کیا گیا ہے، اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ تاریخ و یوم ولادت دوشنبہ ماہ ربیع الاول ہے مگر دوشنبہ/پیر بارہ ربیع الاول کو پڑتا ہے یا ۸/ربیع الاول کو یا ۹/ربیع الاول یا کسی اور تاریخ کو۔ متاخر سیرت نگاروں نے کسی زائچہ نگار، منجم یا راوی یا فلکی تحقیق سے متاثر ہو کر دوسری روایات یا تاریخیں قبول کر لی ہیں، جیسے شبلی نعمانی نے محمود پاشا کی تحقیق کو تسلیم کر کے ۹/ربیع الاول تسلیم کی ہے (سیرۃ النبی، اعظم گڈھ ۱۹۸۳ء، اول ۱۷۱-۱۷۲، حاشیہ ۱)، سلیمان منصور پوری نے لکھا ہے کہ "زاد المعاد ص ۱۸ میں ۸/ربیع لکھی ہے، دوشنبہ کے دن پر اتفاق ہے، چوں کہ دوشنبہ کا دن ۹ کو پڑتا ہے، اس لیے وہی صحیح ہے" (رحمۃ للعالمین، دہلی ۱۹۸۰ء، اول ۴۷ مع حاشیہ ۶)، ان کے اور محمود پاشا کے ایک سلفی مقلد سیرت نگار صفی الرحمن مبارک پوری نے اسی تاریخ کو تقلیداً قبول کیا ہے (الرحیق المختوم، الریاض ۱۹۹۷ء، ۵۴ مع حاشیہ ایک)، جب کہ ادریس کاندھلوی نے ۸/ربیع الاول یوم دوشنبہ کو اختیار کرنے کے ساتھ اسے جمہور علما کا قول بنا دیا ہے، ان کی بحث زرقانی، اول ۱۳۰-۱۳۳ سے ماخوذ ہے (سیرۃ المصطفیٰ، دیوبند (دارالکتاب) غیر مورخہ، اول، ۵۱ مع حاشیہ ۱ تا ۳)، سردست ان اختلافی تاریخوں سے بحث نہیں کہ وہ تقویم کے حساب یعنی دوشنبہ کی ماہ ربیع الاول کی کسی تاریخ سے تطبیق پر مبنی ہیں جو غلط بھی ہو سکتی ہیں اور جن کی غلطی متعدد محققوں نے واضح کی ہے۔

بعثت نبوی: دوشنبہ ۱۲/ربیع الاول یوم بعثت کے باب میں حافظ ابن سید الناس نے کئی

تاریخیں نقل کی ہیں جن میں سے ایک ۸/ربیع الاول ہے، وہ اصل میں ولادت نبوی کی تاریخ ۸/ربیع الاول عام الفیل پر مبنی ہے کیوں کہ ابن اسحاق، امام بخاری اور دوسرے کئی اماماں حدیث وسیرت کے مطابق چالیس سال کے پورے ہوتے ہی یعنی چالیس سال اور ایک دن کی مدت خاص پر رسول اکرم ﷺ کو نبوت سے سرفراز کیا گیا، ظاہر ہے کہ جن راویوں، سیرت نگاروں اور لکھنے والوں نے ۸/یا ۹/ربیع الاول تاریخ ولادت تسلیم کی ہے، ان کے حساب سے چالیس سال کے بعد ۸/یا ۹/ربیع الاول ہی تاریخ بعثت ہوگی اور جن مورخین واہل سیر نے ۱۲/ربیع الاول کو تاریخ ولادت مانا ہے ان کے نزدیک ۱۲/ربیع الاول ہی تاریخ بعثت ٹھہرے گی، بارہ ربیع الاول کو اب اجماع واتفاق جمہور کا درجہ حاصل ہے، لہذا رسول اکرم ﷺ کی بعثت کی تاریخ ۱۲/ربیع الاول ہی قرار پاتی ہے۔ (عیون الاثر، اول ۴۰-۳۹ ومابعد، ۱۳-۱۱۱)، اس کی ایک مثال سلیمان منصور پوری نے فراہم کی ہے "جب آنحضرت ﷺ کی عمر چالیس سال قمری پر ایک دن اوپر ہوا تو ۹/ربیع الاول ۴۱ میلادی (مطابق ۱۲/فروری ۶۱۰ء) کو بروز دوشنبہ روح الامین خدا کا حکم نبوت لے کر آنحضرت ﷺ کے پاس آیا، اس وقت آنحضرت ﷺ غار حرا میں تھے......" (رحمۃ للعالمین اول ۴۷، الرحیق المختوم ۶۶-۶۵ نے رحمۃ للعالمین کی روایت بدء الوحی/رویائے صادقہ کے لیے قبول کی ہے اور ۲۱/رمضان دوشنبہ/۱۰/اگست ۶۱۰ء تنزیل وحی کے لیے مقرر کی ہے، اکرم ضیاء عمری نے صحیح بخاری، صحیح مسلم اور سنن ابی داؤد کی احادیث نبوی کی سند پر لکھا ہے کہ آپ ﷺ چالیس برس کی عمر میں نبی بنائے گئے اور اولین وحی آپ ﷺ پر دوشنبہ کو اتری (۱/۱۲۴)۔

دراصل رسول اکرم ﷺ کی بعثت اور قرآن مجید کی تنزیل کے دو الگ الگ واقعات کو خلط ملط کر کے ان کو ایک سمجھ لیا گیا اور تمام اہل سیرت وحدیث نے الا ماشاء اللہ، ان دونوں میں فرق نہیں کیا، اسی بنا پر انہوں نے بدء الوحی کے باب میں رویائے صادقہ کے آغاز اور اس کی ششماہہ مدت کو دیباچہ نبوت (شبلی، اول ۲۰۲-۲۰۳) یا تاشیر نبوت (ادریس کاندھلوی، اول ۱۲۰-۱۳۳) سمجھا اور تنزیل قرآن کریم کو جو چھ ماہ بعد رمضان مبارک کی لیلۃ القدر میں شروع ہوئی، اصل بعثت و نبوت قرار دیا اور ان دونوں میں چھ ماہ کی مدت کے وقفہ کے سبب جو اختلاف پیدا ہوا، اس

نے ربیع الاول اور رمضان کی تاریخوں میں اختلاف وتنازع پیدا کیا۔ خاکسار راقم نے کہیں اور لکھا ہے کہ بعثت نبوی تو ۱۲؍ربیع الاول ۴۱ نبوی کو ہوئی جب رسول اکرم ﷺ کی عمر شریف چالیس سال اور ایک دن تھی اور قرآن مجید کی صورت میں وحی ربانی کا نزول اس کے چھ ماہ بعد رمضان المبارک کی لیلۃ القدر کو ہوا، جس کی صراحت قرآن مجید (سورہ لیلۃ القدر:۱) نے خود کی ہے (تاریخ تہذیب اسلامی، نئی دہلی ۱۹۹۲ء، ۶-۱۰۵ بالخصوص)، اس موضوع پر تحقیق روایات و مباحث تیار ہے جو جلد ہی پیش کی جائے گی۔

بعثت نبوی کی تاریخ و یوم کے بارے میں قاضی سلیمان منصور پوری نے جو بیان دیا ہے کہ "جب آنحضرت ﷺ کی چالیس سال قمری پر ایک دن اوپر ہوا" وہ امام سیرت ابن اسحاق اور امام حدیث بخاری وغیرہ کے بیانات و روایات اور تحقیقات پر مبنی ہے، باقی تاریخوں کی تعیین قاضی صاحب کی اپنی ہے جو قابل لحاظ نہیں رہ گئی کہ تقویم کے غلط حساب پر مبنی ہے، امام بخاری اور دوسرے متعدد اماماں حدیث و سیرت نے یہ وضاحت کی ہے کہ رسول اکرم ﷺ پر نزول وحی کا آغاز رویائے صادقہ کے دیکھنے سے ہوا جو تنزیل قرآن مجید ۔ یعنی اولین تنزیل قرآن کریم ۔ سے چھ ماہ پہلے ربیع الاول میں شروع ہوا تھا کیوں کہ قرآن مجید کی تنزیل ماہ رمضان ۴۱ نبوی سے آنی شروع ہوئی اور اس پر سب کا اتفاق ہے (کتاب بدء الوحی، ۳-باب، حدیث حضرت عائشہؓ، فتح الباری، اول، مذکورہ بالا کتاب و باب، ۷-۳-۲۹ بالخصوص ۲۷)، حافظ ابن حجر عسقلانی نے امام بیہقی کی روایت نقل کی ہے کہ رویا کی مدت چھ ماہ تھی اور اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اس بنا پر رویا کے ذریعہ نبوت کی ابتدا آپ ﷺ کی ولادت کے مہینہ یعنی ربیع الاول میں ہوئی جب آپ ﷺ کے چالیس سال پورے ہوئے تھے، تنزیل قرآن کو بیداری کی وحی (وحی الیقظۃ) قرار دے کر اس کی تاریخ ابتدا رمضان کے مہینہ میں متعین کی ہے، امام بخاری نے دوسرے مقام پر یہ وضاحت کی ہے کہ جب آپ ﷺ چالیس برس کے ہوئے تو نزول وحی کا سلسلہ شروع ہوا اور ایک حدیث میں یہ مزید وضاحت ہے کہ چالیس پورے ہونے پر مبعوث فرمائے گئے: "انہ ﷺ بعث علی رأس اربعین"، حافظ ابن حجر نے اور دوسرے شارحین حدیث نے اس کی تعبیر یہ کی ہے کہ چالیس سال پورے ہوتے ہی یعنی چالیس سے اوپر ایک دن (اربعین سنۃ و یوم) آپ ﷺ

نبی و رسول بنائے گئے (فتح الباری، کتاب مناقب الانصار، باب مبعث النبی ﷺ، ج ۷، ۲۰۷، حدیث ۳۸۵۱، عن ابن عباسؓ)، حافظ ابن سید الناس نے "بعثت علی رأس الاربعین" کی حدیث حضرت انس بن مالکؓ سے نقل کرنے کے بعد امام بخاری، و ابن حجر وغیرہ سے اتفاق کیا ہے (عیون الاثر، اول ۱۱۰ و مابعد)، ڈاکٹر اکرم ضیاء عمری کا بیان اوپر گزر چکا کہ صحیح بخاری کے مطابق رسول اکرم ﷺ چالیس برس کے ہوتے ہی نبی بنائے گئے اور صحیح مسلم و سنن ابی داؤد کے مطابق پہلی وحی رتنزیل دوشنبہ کے دن آپ ﷺ کے پاس آئی (السیرۃ النبویۃ الصحیحۃ، اول ۱۲۴)۔

ہجرت نبوی: دوشنبہ ۱۲؍ربیع الاول

دوشنبہ ۱۲؍ربیع الاول ۵۳ نبوی کے یوم ہجرت کی شہادتیں بھی کتب حدیث و سیرت میں کافی ہیں، حافظ ابن حجر عسقلانی نے امام بخاری کے قائم کردہ باب ہجرت نبوی کی تشریح میں ہجرت کی تاریخ سے مدلل بحث کی ہے، انہوں نے امام سیرت ابن اسحاق کا حتمی بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ربیع الاول کی پہلی تاریخ کو مکہ مکرمہ (غار ثور) سے روانہ ہوئے ...... اور بارہ ربیع الاول کو مدینہ منورہ پہنچے، حافظ موصوف نے اس بنا پر شہر مکہ سے روانگی کا دن جمعرات بتایا ہے ...... و خرج لهلال ربيع الاول وقدم المدينة لاثنتى عشرة خلت من ربيع الاول ، قلت : وعلى هذا خرج يوم الخميس، انہوں نے امام ترمذی، امام حاکم اور حافظ اموی کی روایات بھی بیان کی ہیں جو بیعت عقبۂ آخرہ اور ہجرت مدینہ کی درمیانی مدت کی تعیین سے متعلق ہیں۔ (فتح الباری، کتاب مناقب الانصار، ۴۵- باب هجرة النبی ﷺ و اصحابه الی المدينة، ہفتم، ۲۸۱-۸۳ بالخصوص ۲۸۳)

امام سہیلی نے مسجد قبا کی تعمیر کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے بنو عمرو بن عوف کے محلہ میں آکر قیام کیا اور پیر، منگل، بدھ اور جمعرات تک قبا میں سکونت پذیر رہے اور پھر مسجد قبا کی تعمیر کی (الروض الانف، چہارم ۲۳۲)، حافظ ابن سید الناس نے حدیث ہجرت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اہل مدینہ رسول اللہ ﷺ کی روانگی کی خبر سن کر روزانہ آپ کے استقبال کے لیے نکلتے تھے لیکن طویل انتظار کے بعد مایوس ہو کر گھروں کو لوٹ جاتے، بالآخر جب دوشنبہ ۱۲؍ربیع الاول کا دن تھا اور اہل مدینہ مایوس ہو کر لوٹ گئے تھے کہ اس دن رسول اکرم ﷺ دھوپ تیز ہونے کے بعد قبا میں پہنچے اور بنو عمرو بن عوف کے حضرت کلثوم بن ہدمؓ کے گھر میں

اترے ......" وکان اھل المدینة یتوکفون قدوم رسول الله ﷺ حین بلغھم توجھہ الیھم فکانوا یخرجون کل یوم لذلک اول النھار ثم یرجعون حتی کان یوم الاثنین لاثنتی عشرة لیلة خلت من شھر ربیع الاول خرجوا لذلک علی عادتھم فرجعوا ...... ثم قدم من یومہ ذلک حین اشتد الضحی فنزل بقباء علی بن عمر بن عوف علی کلثوم بن ھدم ......" (عیون الاثر، اول ۲۵۳، ومابعد)

جدید سیرت نگاروں میں مولانا شبلیؒ نے آٹھ ربیع الاول ۱۳ نبوی (مطابق ۲۰/ستمبر ۶۲۲ء) کو "اکثر مورخین کی متفقہ تاریخ" بتایا ہے اور محمد بن موسیٰ خوارزمی کے مطابق جمعرات کا دن۔ لیکن حاشیہ میں اس پر نقد کیا ہے کہ "جدید حساب سے دوشنبہ کا دن آتا ہے" (سیرۃ النبی، اول، ۲۷۷، حاشیہ ۲)، قاضی سلیمان منصور پوری کا بیان ہے کہ رسول اکرم ﷺ "مدینہ کی جانب یکم ربیع الاول روز دوشنبہ (۱۶/ستمبر ۶۲۲ء) کو روانہ ہوئے......۸/ربیع الاول ۱۳ نبوت روز دوشنبہ (۲۳/ستمبر ۶۲۲ء)...... تھی کہ خدا کا نبی قبا میں پہنچ گیا...... ۱۲/ربیع الاول-۱ ہجرت کو جمعہ کا دن تھا، نبی ﷺ قبا سے سوار ہو کر بنی سالم کے گھروں تک پہنچے تھے کہ جمعہ کا وقت ہوگیا، یہاں سو آدمیوں کے ساتھ جمعہ پڑھا......" (رحمۃ للعالمین، اول ۸۷ اور ۹۱)، دوشنبہ کے لیے قاضی موصوف نے بخاری کا حوالہ دیا ہے، باقی تاریخیں ان کے تقویمی حساب پر مبنی ہیں، قاضی سلیمان کے سلفی مقلد صفی الرحمن مبارک پوری نے رحمۃ للعالمین ۱/۱۰۲ کے حوالہ سے دوشنبہ ۸/ربیع الاول تو قبول کی ہے مگر سنہ ۱۴ نبوی بتایا ہے جو ہجرت کا سال اول تھا...... "وفی یوم الاثنین ۸/ربیع الاول سنة ١٤ من النبوة – وھی السنة الاولی من الھجرة – الموافق ۲۳ ستمبر ٦٢٢ م نزل رسول الله ﷺ بقباء" (الرحیق المختوم ۱۷۰-۱۷۱ مع حاشیہ ۴)، ادریس کاندھلوی نے اگرچہ ابن اسحاق کی بیان کردہ تاریخ ہجرت دوشنبہ ۱۲/ربیع الاول ۱۳ نبوی" کو نقل ضرور کیا ہے کہ علمائے سیر کا بیان قبول کیا ہے جس کے مطابق رسول اکرم ﷺ کی مکہ سے روانگی پنجشنبہ ۲۷/صفر المظفر کو ہوئی تھی اور تین شب غار ثور میں قیام کے بعد یکم ربیع الاول بروز دوشنبہ مدینہ کو روانگی ہوئی تھی، انہوں نے ۸/ربیع الاول بروز دوشنبہ دوپہر کے وقت آپ کے قبا میں نزول اجلال فرمانے کی تاریخ متعین کی ہے اور حوالہ صرف زرقانی، ج ۱، ص ۳۵۱ کا

دیا ہے اور اسی کو علامہ ابن حزم اور حافظ مغلطائی کا قول قرار دیا ہے (سیرۃ المصطفیٰ، اول ۳۹۹)۔ احادیث صحیحہ پر مبنی سیرت نبوی لکھنے والے صاحب قلم اکرم ضیاء عمری نے امام حاکم کا قول نقل کیا ہے کہ "اخبار (روایات) تواتر سے آئی ہیں کہ آپ ﷺ کی روانگی دوشنبہ کو ہوئی اور مدینہ میں آمد بھی دوشنبہ کو ہوئی": تواترت الاخبار أن خروجه کان یوم الاثنین و دخوله المدینة کان یوم الاثنین (السیرۃ النبویۃ الصحیحۃ، ۲۰۷، بحوالہ فتح الباری ۷/۲۳۶)، انہوں نے غار ثور سے روانگی کی ایک تاریخ دوشنبہ ۴/ربیع الاول کو واہیات قرار دیا ہے (۲۱۱-۲۱۲) پھر قبا میں آمد کی تاریخ ابن ہشام سے نقل کی ہے جو "دوشنبہ بارہ ربیع الاول بہ وقت دوپہر" ہے، مستدرک حاکم ۳/۸ کا حوالہ دے کر کہا ہے کہ اس روایت کی اسناد حسن ہے اور حاکم کا قول نقل کیا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے اور امام مسلم کی شرط کے مطابق ہے مگر ان دونوں (شیخین - بخاری و مسلم) نے اس کی تخریج نہیں کی ہے، البتہ حافظ ابن حجر نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور اس کے دو دوسرے "طریق" کی طرف بھی اشارہ کیا ہے (السیرۃ النبویۃ الصحیحۃ، ۲۱۷-۲۱۸ مع حاشیہ ۱ بحوالہ فتح الباری ۷/۲۳۸، سیرت ابن ہشام، ۱/۴۹۱-۴۹۲ بلا سند، صحیح مسلم، ۴/۲۳۱۱ و فتح الباری ۷/۲۴۴)، گویا کہ انہوں نے دوشنبہ ۱۲/ربیع الاول کی تاریخ کو یوم ہجرت نبوی مان لیا ہے خواہ اس کے لیے ان کو ایک سیرت نگار کی روایت ہی قبول کرنی پڑی ہو، انہوں نے البتہ اس کے لیے سند دو اماما ن حدیث - حاکم و ابن حجر کی روایات اور تبصروں سے حاصل کی ہے اور اس طرح اس کی "تصحیح" کر لی ہے۔

وفات نبوی: دوشنبہ ۱۲/ربیع الاول ابن اسحاق/ابن ہشام کی سیرت اور ان کے شارح سہیلی کے حوالے سے رسول اکرم ﷺ کی وفات حسرت آیات کا دن دوشنبہ/پیر بیان ہو چکا ہے اور بعض اماما ن حدیث جیسے ترمذی، مسلم، احمد وغیرہ (جامع صحیح بخاری، کتاب الجنائز، ۹۴: باب موت یوم الاثنین، حدیث ۱۳۸۷، فتح الباری ۳/۳۲۰-۳۲۲) اور جدید سیرت نگار جیسے مسعود احمد کے حوالے سے دوشنبہ کو آپ ﷺ کی وفات کا دن قرار دینے کا ذکر بھی اوپر آچکا ہے (صحیح تاریخ الاسلام والمسلمین ۵۹۹ بحوالہ صحیح بخاری، مختلف ابواب جیسے کتاب الجنائز، باب موت الاثنین، صحیح مسلم، مختلف ابواب)، اگرچہ ان "تعینات یوم" میں تاریخ و ماہ کا ذکر

نہیں کیا گیا لیکن متعدد روایات، احادیث واخبار کا تواتر بھی ہے اور اتفاق بھی کہ رسول اکرم ﷺ کی وفات ''دوشنبہ؍پیر ۱۲؍ربیع الاول'' کو ہوئی، ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے امام بخاری کے ''باب مرض النبی ﷺ ووفاتہ'' پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''آپ ﷺ کی وفات دوشنبہ ماہ ربیع الاول'' کو ہوئی اور اس پر تقریباً اجماع ہے مگر امام بزار نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی ایک روایت نقل کی ہے جو اس حادثہ کو ۱۱؍ رمضان میں واقع ہونا بتاتی ہے، اس ایک اختلاف نے اجماع کو ناممکن بنادیا، پھر امام ابن اسحاق اور جمہور کے نزدیک وفات کی تاریخ بارہ ربیع الاول ہے، دوشنبہ پر کسی کو اختلاف نہیں: ''وکانت وفاته یوم الاثنین بلا خلاف من ربیع الاول وکاد ان یکون اجماعا، لکن فی حدیث ابن مسعود عند البزار فی حادی عشر رمضان، ثم عند ابن اسحاق والجمهور انها فی الثانی عشر منه ......'' (فتح الباری، ہشتم ۶۳-۱۶۲) حافظ ابن حجر نے اس کے بعد دوسرے امامان سیرت وحدیث کی بیان کردہ تاریخ ہائے وفات دی ہیں جیسے موسیٰ بن عقبہ، امام لیث، خوارزمی اور ابن زبیر کے نزدیک ''اول ربیع الاول'' ہے، ابومخنف اور کلبی کے ہاں ''دو ربیع الاول'' ہے اور اسی کو شارح ابن ہشام سہیلی نے اختیار کیا ہے، حافظ موصوف نے اس کے بعد آپ کے آخری حج - حجۃ الوداع - کی تاریخ اور اس کی اور وفات نبوی کی درمیانی مدت سے متعلق مختلف اقوال اور تاریخوں سے بحث کرکے رسول اکرم ﷺ کے آغاز مرض اور تاریخ وفات کی درمیانی مدت اور ان کے بارے میں مختلف اقوال سے تعرض کیا ہے، آخر میں جمہور کی بیان کردہ اور متفقہ تاریخ وفات - پیر؍دوشنبہ بارہ ربیع الاول - کی تائید میں قاضی بدرالدین ابن جماعہ کی دلیل بیان کرکے اس کو قابل ترجیح قرار دیا ہے (فتح الباری، کتاب المغازی، باب مرض النبی ﷺ ووفاته، ہشتم ۸۸-۱۶۲، بالخصوص ۱۸۰ حدیث ۴۴۴۸)۔

حافظ ابن سید الناس کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کی وفات کے دن پر تو اہل علم کا اتفاق ہے کہ وہ ''دوشنبہ اور ماہ ربیع الاول'' تھا، البتہ تاریخ پر اختلاف ہے، واقدی اور جمہور نے ''بارہ ربیع الاول'' بیان کی ہے، طبرانی نے دوشنبہ ۲؍ربیع الاول کو ترجیح دی ہے، ابوبکر خوارزمی نے ''پہلی'' یا ''دو ربیع الاول'' کو ممکن بتایا ہے، جمہور کی متفقہ تاریخ پر امام سہیلی کا نقد

بیان کیا ہے کہ حجۃ الوداع میں جمعہ کو وقوف عرفات پر علما کا اتفاق ہے اس لئے یہ تاریخ وفات تقویمی اعتبار سے غلط ہے اس بحث میں اہم نکتہ یہ ہے کہ حافظ ابن حجر کے بیان کردہ تنقیدات ہوں یا حافظ ابن سید الناس کی روایات نقد، ان سب نے تقویمی حساب سے جمہور کی متفقہ تاریخ کو غلط ٹھہرایا ہے، حسابی تقویم یا تقویمی حساب خواہ کوئی بھی ہو حتمی نہیں ہوتا، اور بالعموم وہ غلط ثابت ہوا ہے کہ حساب لگانے میں کہیں نہ کہیں غلطی ہوجاتی ہے یا اس میں دو مقامات اور تاریخ وفات کے ضمن میں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے اختلاف مطالعہ کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا، لہذا ایسے تمام اعتراضات محل نظر ہیں اور ان کی بنا، پر متعینہ تاریخیں خالص ظن وگمان پر مبنی، اس کے برخلاف جمہور کی بیان کردہ تاریخ کے پیچھے دو تصدیقی قوتیں ہوتی ہیں: اول صریح بیان کی قوت اور دوم اجماع واتفاق اکثریت کی قوت، اس باب میں تیسری قوت یہ بھی ہے کہ ابن اسحاق، ابن ہشام اور واقدی وغیرہ کی بیان کردہ تاریخ قدیم ترین سیرت نگاروں کی دی ہوئی ہے اور وہ بھی محققین فن کی، لہذا اس کو غلط قرار دینے کے لئے کوئی اور دلیل قطعی چاہیے جو نایاب ہے۔

عہد جدید کے سیرت نگاروں میں مولانا شبلیؒ نے روایات حدیث اور حافظ ابن حجر کی بعض تصریحات کی بنا پر وفات نبوی کی تاریخ ''دوشنبہ یکم ربیع الاول'' قبول کی ہے (سیرۃ النبی، اعظم گڈھ، ۱۹۸۴ء، دوم ۱۸۳، حاشیہ ایک ومابعد) قاضی سلیمان منصور پوری نے صراحت کی ہے کہ ''۱۲؍ربیع الاول ۱۱ ہجری یوم دوشنبہ بوقت چاشت تھا کہ جسم اطہر سے روح انور نے پرواز کیا، اس وقت عمر مبارک ۶۳ سال پر چار دن تھی......'' (رحمۃ للعالمین، ۲۵۱)، ادریس کاندھلوی نے دوشنبہ کے دن اور ربیع الاول کے مہینہ پر علما کا اتفاق نقل کرنے کے بعد ۱۲؍ربیع الاول کی جمہور کی تاریخ پر تقویمی حساب سے تنقیدوں کا ذکر کیا ہے اور کسی تاریخ کو واضح ترجیح نہیں دی تاہم مکہ ومدینہ کے اختلاف مطالع کے سبب ۱۲؍ربیع الاول کو قابل ترجیح تسلیم کرنے کا عندیہ دیا ہے (سیرۃ المصطفیٰ، سوم، ۹/۱-۱۹۷، تفصیل کے لیے فتاوی مولانا عبدالحئی لکھنوی کی جلد سوم کی مراجعت کا حوالہ بھی دیا ہے)۔

قاضی سلیمان منصور پوری کے سلفی مقلد صفی الرحمن مبارک پوری نے اپنے سلفی امام کی متعین کردہ تاریخ وفات یعنی ''دوشنبہ ۱۲؍ربیع الاول ۱۱ھ بہ عمر ۶۳ سال چار دن'' قبول کرلی

ہے اور حوالہ میں کسی ماخذ کا حتی کہ قاضی منصور پوری کا بھی حوالہ نہیں دیا ہے (الرحیق المختوم،
۴۶۹)، ڈاکٹر اکرم ضیاء عمری نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دوشنبہ ۱۲/ربیع الاول کو وفات
پائی ......" وما ت فی یوم الاثنین فی الثانی عشر من ربیع الاول" اور اپنے حاشیہ
میں لکھا ہے کہ حافظ ابن حجر نے ابو مخنف کے اس قول پر کہ آپ ﷺ نے "دو ربیع الاول" کو
وفات پائی مگر دوسروں نے دو کے بعد دس کو بڑھا کر ان کی غلطی واضح کی ہے: "اعتمد الحافظ
ابن حجر قول ابی مخنف [كذا] انه مات فی ثانی شهر ربیع الاول وان
الآخرین زادوا "عشر" بعد "ثانی" غلطاً منهم" (فتح الباری ۸/۱۳۰ (السیرۃ النبویۃ
الصحیحۃ، ۵۵۳ مع حاشیہ ۴)۔

حاصل مطالعہ اس حقیقت سے کوئی انکار کی جسارت نہیں کرسکتا کہ اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں
ایک خاص مصلحت و حکمت ہوتی ہے، زمان کا فرق اور مکان کا اختلاف بھی سنت الٰہی ہے اور
حکمت ربانی کا مظہر بھی خواہ ہم اس کو سمجھ سکیں یا نہ سمجھ سکیں، حضرت محمد بن عبداللہ ہاشمی ﷺ کا
وجود و ظہور اسی سنت و حکمت الٰہی سے وابستہ و پیوستہ ہے، تمام انبیائے کرام سے قبل وجود محمدی
آپ ﷺ کی افضلیت کی حکمت رکھتا ہے اور سب کے آخر میں آپ ﷺ کا ظہور آپ کے خاتم النبیین
ہونے کی حکمت کا حامل ہے، آب وگل کے درمیان حضرت آدم علیہ السلام تعمیر و تشکیل کے اولین
مرحلہ سے گزر رہے تھے کہ نبوت محمدی علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کا معاملہ علم الٰہی میں
فیصل اور تقدیر ربانی میں طے ہو چکا تھا، اصول تدریج و ترقی کے عین مطابق سلسلۂ انبیاء علیہم السلام
مختلف مقامات اور عہد بہ عہد ادوار میں جاری رہا کہ ہر پیش رو نبی و رسول کی تعمیر نبوت میں ان
کے جانشین و وارث اضافہ فرماتے رہیں، جب قصر نبوت کی تکمیل کا وقت آیا تو حکمت الٰہی نے
جناب محمد ہاشمی عربی علیہ الصلوۃ والتسلیم کی بعثت کا فیصلہ کیا تا کہ اس قصر نبوت میں آخری
اینٹ لگا کر اسے مکمل فرمادیں۔

اسی حکمت و تقدیر ربانی نے ایک اور فیصلہ کیا کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی ولادت
عرب ملک کے شہر مکہ مکرمہ میں ہو جو "اول بیت الٰہی" کا مسکن اور آپ ﷺ کے جد امجد
حضرات اسماعیل و ابراہیم علیہم السلام کا موطن ہے، اسی ربانی حکمت کا یہ بھی تقاضا ہوا کہ

حضور سرور کائنات اور خاتم النبیین علیہ السلام دوشنبہ کو دنیا میں تشریف لائیں، ہفتہ کے اس
روز جب لوگوں/بندوں کے اعمال ان کے مالک و آقا رب العالمین کے حضور پیش کیے جاتے
ہیں، جناب الٰہی میں انسانی دفتر عمل کے پیش ہونے کے روز میلاد النبی کو اہل ایمان کے لیے عید
بنایا گیا اور درود و صلوۃ کو دفتر عمل کا حسین و جمیل حصہ/اللہ تعالیٰ کی حکمت کا یہ بھی فیصلہ ہوا کہ
دوشنبہ کو حیات و سیرت نبوی میں ہی نہیں سنت نبوی میں بھی خاص منزلت و مقام حاصل ہو، اسی
لیے پیر کو سفر شروع کرنے کو سنت و باعث برکات بتایا گیا۔

حیات نبوی اور سنت مطہرہ کے ساتھ جس حکمت نے دوشنبہ/پیر کے دن کو وابستہ کردیا
تھا اسی نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ رسول اکرم ﷺ کی دنیاوی حیات طیبہ کے بعض اہم ترین مراحل و
منازل کو ماہ ربیع الاول سے پیوست کردیا اور اس ماہ مقدس کی تمام تاریخوں میں بارہ تاریخ کو
چن لیا، اس طرح بارہ ربیع الاول بروز دوشنبہ عنوان حیات نبوی بن گئی، منطقی طور سے سال کے
کسی ماہ اور کسی ماہ کے کسی دن اور تاریخ کو واقعات و حوادث جنم لیتے ہیں، ان میں سے بعض
واقعات و حوادث کسی ایک خاص وقت، دن، تاریخ کو بھی واقع ہو جاتے ہیں جن کو حسن اتفاق کا
خوب صورت نام دے دیا جاتا ہے لیکن رسول اکرم ﷺ کی حیات مبارکہ کے چار اہم ترین
واقعات یا مراحل - ولادت، نبوت/بعثت، ہجرت اور وفات - دوشنبہ ۱۲/ربیع الاول کے ساتھ
وابستہ کردیے گئے، ان کو حسن اتفاق بہ وجوہ حکم نہیں قرار دیا جاسکتا۔

حیات نبوی کے ان چاروں مراحل حیات کا تعلق اتفاق، انسانی منصوبہ بندی، بشری
ارادے یا مادی اسباب و علل سے ہرگز نہیں ہے، ان کا رابط دراصل ارادہ و علم الٰہی اور فیصلہ و تقدیر
ربانی سے ہے، کیوں کہ یہ چاروں امور و معاملات - ولادت، بعثت، ہجرت اور وفات - انسانی
فکر و خیال، بشری قبضہ و قدرت اور عناصر کے اختلاط و امتزاج کے نتیجہ میں ظہور میں نہیں آسکتے،
ان کی ایجاد و ابداع خالص تقدیر الٰہی کی پابند ہے اور تقدیر الٰہی حکمت ربانی اور مصالح انسانی سے
وابستہ ہے، حکمت و تقدیر الٰہی اپنے بندوں اور کائنات کے تمام دوسرے مظاہر پر یہ واضح کرنا
چاہتی تھی کہ وہ جب اور جہاں چاہے اپنی رسالت کو رکھے، دوشنبہ ۱۲/ربیع الاول کو اس لیے بھی
منتخب کیا کہ ولادت نبوی ظہور قدسی کا مظہر بنے، بعثت نبوی رحمت عالم کی ضمانت فراہم کرے،

ہجرت نبوی نصرت الٰہی اور غلبہ مسلم اور شوکت دین کو روبہ کار لائے اور وفات نبوی ختم رسالت و نبوت کے مظہر پر آخری مہر لگادے اور عالمیان کائنات کو بتادے کہ اب سعادت دنیوی اور نجات اخروی کا واحد راستہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی مکمل، خالص اور دلی پیروی میں مضمر و مستور ہے، اسی لیے وہ دوشنبہ ۱۲ ربیع الاول کو عالم آب وگل میں تشریف لائے، اسی دن اور تاریخ کو آخری رسول بنے، اسی مبارک دن دار الاسلام کو ہجرت کی اور اسی عالمی دن کو اپنے خالق ومولا سے جاملے، اللھم صل علی سیدنا و مولانا محمد و آلہ و صحبہ و ازواجہ و خلفائہ اجمعین، اللھم صل علی محمد سید المرسلین و خاتم النبیین و رسول الاولین و الآخرین -
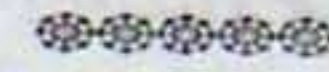
پاکستان میں دارالمصنفین کے نئے نمائندے

جناب حافظ سجاد الٰہی صاحب

Address

Office: 27 A, Peco Mall Godam Road
Loha Market, Badami Bagh
Lahore, Pakistan.

Phone: 03004682752

Home: 196, Ahmad Block Badar Street,
New Garden Town
Lahore, Pakistan.

Phone (R): 5863609

اسلام اور تعلیم نسواں

از:- ضیاء الدین اصلاحی

"بہت عرصہ ہوا مذکورہ بالا عنوان سے میں نے ڈاکٹر مقبول احمد مرحوم کی دعوت پر کلکتہ میں ایک لکچر دیا تھا جو اسی زمانے میں وہاں کے مشہور و مقبول اخبار "آزاد ہند" کے کئی شماروں میں نکلا تھا، اس وقت بھی لوگوں نے خواہش کی تھی کہ اسے کتابچے کی صورت میں چھپوادیا جائے مگر دوسرے کاموں کی وجہ سے اس کی نوبت نہیں آئی۔

اب اس سال فروری میں علی گڑھ جانے کا اتفاق ہوا تو پھر پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی کی خواہش پر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے شعبہ اسلامیات میں اسی موضوع پر لکچر دینے کا اتفاق ہوا، جس کی کئی اخباروں نے رپورٹنگ کی اور وہ کئی اصحاب علم کی نظر سے گزری تو انہوں نے مجھ سے اور ڈاکٹر ظفر الاسلام صاحب سے خواہش کی کہ اس کی فوٹو کاپی انہیں مہیا کردی جائے، ان حضرات کے اصرار پر خیال ہوا کہ پہلے اسے "معارف" میں شائع کردیا جائے اور آیندہ یہ اور بعض دوسرے مضامین یک جا کر کے کتابی صورت میں چھاپے جائیں، اس سلسلے میں پورے مقالے پر دوبارہ نظر ڈالی گئی اور کسی قدر حذف و اضافے کے بعد وہ قارئین معارف کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے"۔ "ض"

اسلام میں علم و تعلیم کی اہمیت مسلم ہے، اس کی بنیاد ہی علم و معرفت اور بصیرت پر ہے، نبی اکرم ﷺ پر سب سے پہلی جو وحی نازل ہوئی، اس میں پڑھنے کے علاوہ اس امر کا بھی تذکرہ ہے کہ علم و قلم ہی ترقی و تہذیب اور عظمت و کرامت کے ضامن ہیں:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ، خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ، اِقْرَاْ وَ رَبُّکَ الْاَکْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ، عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ (العلق ۹۶: ۱-۵)

پڑھ اپنے اس خداوند کے نام سے، جس نے پیدا کیا، پیدا کیا انسان کو خون کے تھکے سے، پڑھ اور تیرا خداوند بڑا کریم ہے، جس نے تعلیم دی قلم کے واسطہ سے، اس نے سکھایا انسان کو وہ کچھ جو وہ نہیں جانتا تھا۔

اور خود نبی کریم ﷺ نے اپنی اہم خصوصیت یہ بتائی ہے کہ بعثت معلما (۱) (میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں)۔

قرآن مجید کی متعدد آیتوں اور بہ کثرت حدیثوں میں علم و تعلیم کی اہمیت و ضرورت پوری طرح واضح کردی گئی ہے، جس کی تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے، اس کے باوجود تعلیم کی جانب سے مسلمانوں کی غفلت اور بے پروائی سخت حیرت انگیز اور نہایت تعجب خیز ہے۔

ابتدائے اسلام میں علم مسلمانوں کا طغرائے امتیاز تھا اور وہ اس کے حصول کے لیے ہر قسم کی محنت و مجاہدہ کرتے تھے، جہاں بھی انہیں علم و دانش کی کسی بات کا سراغ لگتا تھا وہ اسے اپنی متاع گم شدہ سمجھتے تھے اور اسے حاصل کرنے کے لیے دور دراز جگہوں کا سفر کرتے تھے، ان کے شوق علم اور جوش طلب کے واقعات سے تاریخ، رجال اور طبقات کی کتابیں بھری ہوئی ہیں اور اب تک مسلمانوں کے گوناگوں علمی کارناموں کی گونج سے گنبد مینا پرشور ہے ؎

سالہا گوش جہاں زمزمہ زا خواہد شد   زیں نواہا کہ دریں گنبد گردوں زدہ ام

مگر اب مسلمانوں کے علم و فن اور تحقیق و اختراع کا ہرا بھرا سرسبز و شاداب اور تناور درخت جو پھلوں اور پھولوں سے لدا ہوا تھا مرجھا اور خشک ہوگیا ہے، اس میں ایسی پت جھڑ لگ گئی ہے کہ پھول پھل سب غائب ہوگئے ہیں اور مسلمان ایجاد و اختراع کی تمام صلاحیتیں گنوا بیٹھے ہیں۔

مسلمانوں کے اسی علمی تنزل کے دور میں ان کے دل و دماغ میں یہ خیال بھی سرایت کرگیا کہ عورتوں کا میدان عمل گھر کی چہاردیواری ہے، علم و فن کی تحصیل ان کے لیے بے سود ہے، اب گو یہ دور ختم ہورہا ہے اور عورتوں کی تعلیم کا مسئلہ بہت زیادہ متنازع فیہ نہیں رہا ہے تاہم اب بھی عموماً

(۱) سنن ابن ماجہ مقدمہ باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم ص ۲۱، اصح المطابع دہلی بدون سن۔

عورتیں تعلیم سے بے بہرہ رہتی ہیں اور مسلمانوں کی اکثریت خصوصاً دیہاتوں میں جہاں ان کی بڑی آبادی ہے ابھی تک لڑکیوں کی تعلیم دلانا معیوب سمجھا جاتا ہے، یورپ کی سیاسی بالادستی سے دین و دنیا کی تقسیم کا جو فتنہ اٹھا اس کے نتیجہ میں تعلیم بھی دینی اور دنیاوی دو خانوں میں بٹ گئی ہے اور عام خیال یہ ہے کہ بچیوں کے لیے بہ قدر ضرورت دینی تعلیم حاصل کرلینا کافی ہے، اعلا دینی تعلیم کا حصول یا جدید علوم و افکار اور نئے خیالات و رجحانات سے واقف ہونا عورتوں کے لیے نامناسب ہے، اس سے ان کے اصلی بنیادی فرض یعنی امور خانہ داری کو انجام دینے میں خلل واقع ہوگا، متمدن اور ترقی یافتہ لوگوں کا بھی یہ حال ہے کہ وہ لڑکوں کی پرورش و پرداخت اور ان کی تعلیم و تربیت میں جو اہتمام کرتے ہیں، اس کا عشر عشیر اہتمام بھی لڑکیوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت پر نہیں کرتے۔

افسوس اور سخت افسوس یہ ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم و تربیت سے اس ہمہ گیر بے توجہی و بے اعتنائی کی بنیاد مذہب کو قرار دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ از روئے شریعت عورتیں صرف خانگی اعمال کو انجام دینے کی مکلف ہیں، گھر کے باہر کی ہوا کا کوئی جھونکا بھی انہیں نہیں لگنا چاہیے، اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تعلیم کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر اور عقلی و نقلی دلائل کی وضاحت کسی قدر تفصیل سے کردی جائے۔

اس سلسلے میں پہلے یہ مقدمات ذہن نشین رہنے چاہئیں:

۱- اسلام کی دعوت و پیغام سارے انسانوں کے لیے ہے اور رسول اکرم ﷺ کی بعثت عرب و عجم، کالے گورے اور مرد و عورت سب کے لیے ہوئی تھی، اس لیے اسلام کی تعلیم و ہدایت سے واقف ہونا اور محمد ﷺ کے پیغام و دعوت کو جاننا اور معلوم کرنا سب کے لیے ضروری ہے، اس میں مرد و عورت کی کوئی تخصیص روا نہیں رکھی گئی ہے، عورتیں بھی اسلامی احکام و ہدایات کی ویسے ہی پابندی کریں گی جیسے مرد کریں گے، ایمان و عمل صالح پر نجات و اخروی سعادت منحصر ہے لیکن اس پر کسی ایک ہی طبقہ کا اجارہ نہیں ہے بلکہ عورتیں بھی ایمان و عمل صالح کے تقاضے پورا کرکے اپنی فلاح و اخروی نجات کا سامان اسی طرح کرسکتی ہیں جس طرح مرد کرسکتا ہے، ارشاد ربانی ہے:

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ بَعْضُكُم مِّن بَعْضٍ (آل عمران ۳:۱۹۵)

تو ان کے پروردگار نے ان کی دعا قبول فرمائی کہ میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کروں گا، مرد ہو یا عورت تم سب ایک دوسرے سے ہو۔

دوسری جگہ فرمایا:

وَمَن يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ نَقِيرًا (نساء ۴:۱۲۴)

اور جو نیکی کرے گا خواہ مرد ہو یا عورت اور وہ مومن بھی ہے تو یہی لوگ ہیں جو جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرا بھی حق تلفی نہ ہوگی۔

ایک اور موقع پر کہا گیا ہے:

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ (نساء ۴:۳۲)

مردوں کو حصہ ملے گا اس میں سے جو انہوں نے کمایا اور عورتوں کو حصہ ملے گا اس میں سے جو انہوں نے کمایا۔

رسول اللہ ﷺ جس طرح مردوں سے اسلام و اطاعت کی بیعت لیتے تھے اسی طرح عورتوں سے بھی لیتے تھے تا کہ وہ بھی دین و شریعت پر قائم و استوار رہیں اور اس کی نافرمانی اور گناہ کے کاموں سے بچیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ عَلَىٰ أَن لَّا يُشْرِكْنَ بِاللَّهِ شَيْئًا وَلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَأْتِينَ بِبُهْتَانٍ يَفْتَرِينَهُ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِينَكَ فِي مَعْرُوفٍ فَبَايِعْهُنَّ

اے پیغمبر جب تمہارے پاس مومنہ عورتیں اس بات پر بیعت کے لیے آئیں کہ وہ کسی چیز کو اللہ کا شریک نہ ٹھہرائیں گی اور نہ وہ چوری کریں گی اور نہ بدکاری کی مرتکب ہوں گی اور نہ وہ اپنی اولاد کو قتل کریں گی اور نہ اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان سے متعلق کوئی بہتان تراشیں گی اور نہ کسی امر معروف

وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (الممتحنہ ۶۰:۱۲)

میں تمہاری نافرمانی کریں گی تو ان سے بیعت کرلو اور ان کے لیے اللہ سے مغفرت کی دعا کرو، بے شک اللہ غفور رحیم ہے۔

ان آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ عورتیں بھی مردوں کی طرح ایمان، عمل صالح اور اسلام کی ہر تعلیم و ہدایت اور شریعت کے تمام احکام کی مکلف ہیں، اگر وہ ان پر عمل کریں گی تو ان کو ان کے حسن عمل کا صلہ و ثواب مل کر رہے گا، رسول اللہ ﷺ نے اپنے ایک خطبہ میں بھی اپنے خاندان کے لوگوں اور قریبی عزیزوں کو خاص طور پر اس امر سے آگاہ فرمایا ہے کہ وہ اس زعم میں مبتلا نہ ہوں کہ مجھ سے ان کی قرابت یا تعلق ان کے لیے فائدہ بخش ہوگا بلکہ ان کے کام آنے والی چیز خود ان کا اپنا ایمان و عمل ہوگا، اس موقع پر آپ نے جہاں اپنے بعض مرد افراد خاندان کا نام لیا وہاں اپنی پھوپھی اور بیٹی کا نام بھی لے کر ارشاد فرمایا:

ویا صفیة عمة رسول اللہ لا اغنی عنک من اللہ شیأ و یا فاطمة بنت محمد سلینی ما شئت من مالی لا اغنی عنک من اللہ شیأ (صحیح بخاری کتاب الوصایا باب هل یدخل النساء والولد فی الاقارب، ج ۱، ص ۳۸۵)

اور اے اللہ کے رسول کی پھوپھی صفیہ میں آپ کے لیے اللہ کے یہاں کارآمد نہیں ہوں گا اور اے محمد کی بیٹی فاطمہ مجھ سے میرے مال و دولت میں سے جو چاہو مانگ لو، میں اللہ (کی باز پرس میں) تمہارے کچھ کام نہ آؤں گا۔

یہی نہیں اسلام نے جو چیزیں حرام اور ممنوع قرار دی ہیں ان کی حرمت مردوں کی طرح عورتوں کے لیے بھی ہے اور اگر وہ حدود اللہ سے تجاوز کریں گی تو مردوں کی طرح وہ بھی سزا و عقاب کی مستحق ہوں گی، چنانچہ بدکار مرد کی طرح بدکار عورت کو بھی ۱۰۰ کوڑے لگائے جائیں گے:

الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ (نور ۲۴:۲)

زانی عورت اور زانی مرد دونوں میں سے ہر ایک کو سو سو کوڑے مارو۔

اسلام سے پہلے عرب میں چوروں کو ہاتھ کاٹنے کی سزا دی جاتی تھی، اسلام نے بھی

اس کو باقی رکھا اور اس معاملہ میں مرد و عورت کی کوئی تفریق روا نہیں رکھی اور نہایت صراحت کے ساتھ کہا:

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا اَیْدِیَهُمَا جَزَآءً بِمَا کَسَبَا نَکَالًا مِّنَ اللّٰهِ (مائدہ ۵: ۳۸)

اور چور مرد اور چور عورت دونوں کے ہاتھ کاٹ دو، ان کے کئے کی پاداش اور اللہ کی طرف سے عبرت ناک سزا کے طور پر۔

۸ھ میں فتح مکہ کے موقع پر قبیلہ مخزوم کی ایک عورت چوری کی مرتکب ہوئی، چونکہ وہ ایک شریف خاندان سے تھی اس لیے مسلمانوں کو اسے سزا دیے جانے کے معاملے میں بڑا تامل ہوا اور انہوں نے آنحضرت ﷺ کے پاس آپ کے ایک نہایت محبوب شخص حضرت اسامہ بن زید کو سفارش کے لیے بھیجا، آپ ﷺ بہت برہم ہوئے اور لوگوں کو جمع کر کے ایک خطبہ دیا جس میں فرمایا کہ:

"تم سے پہلے لوگوں کی ہلاکت کا یہی سبب ہوا کہ وہ نیچے طبقہ کے لوگوں پر تو احکام جاری کرتے لیکن اوپر درجہ کے لوگ جب جرم کا ارتکاب کرتے تو ان سے درگزر کرتے، خدا کی قسم! اگر محمد کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ لیتا"۔ (صحیح بخاری، ج ۲، ص ۱۰۰۳، کتاب الحدود باب کراھیة الشفاعة، اصح المطابع دہلی بدون سن)

اس تفصیل کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ مردوں کی طرح علم کا حصول عورتوں کے لیے بھی ضروری ہے، اس کے بغیر نہ وہ ایمان و عمل کے تقاضے پورا کر سکتی ہیں اور نہ دین و شریعت کے احکام و مسائل سے باخبر ہو سکتی ہیں اور نہ ان چیزوں سے آگاہ ہو سکتی ہیں جن کو اسلام نے حرام اور ممنوع قرار دیا ہے۔

۲- اسلام کی دعوت و اشاعت، دین کی تبلیغ و تلقین، رسول اللہ ﷺ کے پیغام و ہدایت کو عام کرنا، تواصی بالحق اور شہادت علی الناس امت محمدیہ کا بنیادی فریضہ ہے، قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں اس کی تصریح موجود ہے، خود آپ ﷺ کا ارشاد ہے بلغوا عنی ولو آیة (۱) یعنی

(۱) صحیح بخاری کتاب الانبیا باب ما ذکر عن بنی اسرائیل، ج ۱، ص ۴۹۱، مطبع اصح المطابع دہلی بدون سن۔

مجھ سے جو کچھ تمہیں معلوم ہو، خواہ وہ ایک ہی بات کیوں نہ ہو اسے دوسروں تک پہنچا دو! خطبۂ حجة الوداع آپ کی تعلیمات و ہدایات کا نچوڑ ہے، اس میں آپ ﷺ اسلام کے ایک ایک منشور اور دستور کا اعلان فرماتے تھے اور اس کے آخر میں یہ تاکید بھی کرتے جاتے تھے کہ فلیبلغ الشاھد الغائب یعنی حاضر و موجود اشخاص غیر حاضر و غیر موجود لوگوں کو میرا پیغام پہنچا دیں۔ (۱)

دین کی اشاعت و تبلیغ کا یہ فریضہ عورتوں پر بھی مردوں کی طرح عائد ہوتا ہے، حجة الوداع میں وہ بھی شریک تھیں اور آپ ﷺ کے ارشادات ان کے لیے بھی مردوں کی طرح تھے، غور کیجیے کہ اسلام کی تبلیغ و دعوت کا یہ ضروری کام اس کے علم و واقفیت کے بغیر کس طرح انجام پا سکتا ہے۔

۳- انسانی نسل مرد و عورت کے اتصال کی رہین منت ہے، اسی سے گھر، خاندان، قبیلہ اور معاشرہ وجود میں آتا ہے، گویا مرد و عورت دونوں انسانی زندگی کے دو پہیے ہیں، گاڑی کے دونوں پہیوں میں سے اگر کوئی بیکار ہو جائے تو جس طرح گاڑی رک جاتی ہے، اسی طرح مرد و عورت میں سے کسی کا وجود معطل ہو جائے تو زندگی کا سفر طے نہیں ہو سکے گا اور حیات انسانی کا شیرازہ درہم برہم ہو جائے گا، گھر، خاندان اور معاشرہ تباہی کے دہانے پر پہنچ جائے گا، یہی وجہ ہے کہ انسانی زندگی کی عافیت و سلامتی، گھر، خاندان اور معاشرہ کی فلاح و بہبود اور کاروبار حیات کی رونق و دلکشی کے لیے مرد و عورت دونوں کا وجود نہایت قیمتی ہے، دونوں کا اشتراک و تعاون ہی ایک خوش گوار ماحول بنا سکتا ہے، ایسی صورت میں دونوں کی دیکھ بھال اور تعلیم و تربیت پر یکساں توجہ دینے کی ضرورت ہے تاکہ وہ اپنے مشترکہ کاموں کو خاطر خواہ طور پر کر سکیں اور ان میں سے ہر ایک اپنے جداگانہ فرائض کو بھی بہتر طریقہ پر انجام دے سکے، اس کے باوجود یہ کیسا اندھیر اور المیہ ہے کہ مرد کی تعلیم و تربیت کا تو بڑا اہتمام کیا جاتا ہے لیکن عورتیں نقش و نگار طاق نسیاں بنادی گئی ہیں، زندگی کے ایک پہیے کی تو حفاظت اور نگہداشت کی جاتی ہے مگر دوسرے پہیے کی جانب سے شدید غفلت و بے پروائی اختیار کی جاتی ہے، کیا اس کا یہ دردناک انجام نہیں ہوگا کہ ہماری زندگی کی گاڑی گڈھے میں گر جائے گی اور اس کے دونوں ہی پہیے ٹوٹ پھوٹ جائیں گے۔

۴- یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ بچوں کی پرورش و پرداخت اور تعلیم و تربیت کی

(۱) بخاری، ج ۱، ص ۱۶، کتاب العلم باب من قعد حیث ینتھی بالمجلس، اصح المطابع۔

ذمہ داری عورتوں پر زیادہ عائد ہوتی ہے کیونکہ مرد اپنی گوناگوں ذمہ داریوں اور مشغولیتوں کی وجہ سے نہ اولاد کی دیکھ بھال بہ قدر ضرورت اچھی طرح کرسکتا ہے اور نہ اتنا وقت صرف کرسکتا ہے جتنا عورتیں کرسکتی ہیں، یہ بھی واقعہ ہے کہ اولاد باپ کے مقابلہ میں ماں سے زیادہ مانوس ہوتی ہے، ان ہی کی آغوش میں پروان چڑھتی ہے، اس لیے عورتوں کی تعلیم نہایت ضروری اور اہم ہے، وہ اگر تعلیم یافتہ نہ ہوں تو یہ تنہا ان ہی کا زیاں نہیں ہوگا بلکہ قوم کی آیندہ نسل کو بھی اس کا خسارہ برداشت کرنا پڑے گا، اسی بنا پر قوم کی تعمیر و ترقی اور آیندہ نسلوں کی تعلیم و تربیت کے لیے بھی عورتوں کی تعلیم و تربیت ناگزیر ہے۔

۵- ایک اور پہلو سے دیکھیے کہ جب لڑکا اور لڑکی دونوں ہماری اولاد ہیں تو دونوں ہمارے یکساں سلوک اور ہمدردی کے مستحق ہیں، مگر معلوم نہیں کس دلیل و منطق سے ہم عورتوں کی تعلیم و تربیت کے علاوہ ان کے دوسرے حقوق کے بارے میں بھی بڑے بخل اور کوتاہی سے کام لیتے ہیں اور دونوں میں فرق و امتیاز روا رکھتے ہیں اور جتنی خوش دلی اور دل سوزی سے بچوں کی تعلیم و تربیت میں دل چسپی لیتے ہیں اتنی دل چسپی بچیوں کی تعلیم و تربیت کے معاملے میں نہیں لیتے، اسلام نے اس تفریق و امتیاز کی شدید مذمت کی ہے، اس کی آمد سے قبل ان پر ہر ظلم و زیادتی روا رکھی گئی تھی، یہاں تک کہ انہیں منقولہ جائداد سمجھا جاتا تھا جو وراثت میں تقسیم ہوتی تھیں، قماربازیوں میں داؤں پر چڑھادی جاتی تھیں لیکن حجۃ الوداع کے دن آپ نے جو عظیم الشان خطبہ دیا، اس میں اس مظلوم گروہ، صنف لطیف اور جوہر نازک کو قدر دانی کا تاج پہنادیا، ارشاد ہوتا ہے:

فاتقوا اللہ فی النساء (۱) عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرو۔

فان لکم علی نسائکم حقا ولھن علیکم حقا (۲) تمہارا عورتوں پر اور ان کا تم پر حق ہے۔

قرآن مجید میں بھی کہا گیا ہے کہ:

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ (بقرہ ۲: ۲۲۸) اور ان عورتوں کے لیے دستور کے مطابق اسی طرح حقوق ہیں جس طرح دستور کے مطابق

---

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب المناسک، باب صفۃ حجۃ النبی، ص ۲۶۳، اصح المطابع (۲) سیرت ابن ہشام، حجۃ الوداع، ج ۱، ص ۳۹۰، مطبع محمد علی صبیح مصر، بدون سن۔

ان پر ذمہ داریاں ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ تعلیم و تربیت عورتوں کا بنیادی حق ہے، ان کے سرپرستوں اور اولیا سے ان کا یہ حق سلب کرنے پر یقیناً مواخذہ ہوگا اور یہ نہایت بدبختی ہی نہیں شدید ناانصافی ہے کہ ہم قوم کے نصف طبقے کو تو تعلیم دلائیں اور نصف طبقے کو اس سے محروم رکھیں۔

۶- اسلام نے تمام طبقوں اور گروہوں کی طرح اولاد کے بھی خواہ وہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں کچھ حقوق بتائے ہیں، اولاد کا سب سے مقدم حق ان کی پرورش و پرداخت ہے، جس کے دائرے میں ظاہری و جسمانی پرورش ہی شامل نہیں ہے بلکہ ان کی باطنی و روحانی اصلاح و تربیت بھی اسی دائرے میں شامل ہے، اسی لیے اہل ایمان کو تاکید کی گئی ہے کہ:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِیْكُمْ نَارًا (تحریم ۶۶: ۶) اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو آگ (جہنم) سے بچاؤ۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اولاد کی تعلیم و تربیت کا پورا خیال رکھا جائے اور ان کو ان تمام برائیوں اور خرابیوں سے بچایا جائے جو ان کو کفر و شرک، جاہلانہ عقاید و نظریات اور باطل اوہام و خیالات میں مبتلا کردیتی ہیں جن کا انجام بالآخر جہنم ہے، والدین اور سرپرستوں کا یہ لازمی حق ہے کہ اپنی اولاد ذکور و اناث کی نگہ داشت اور نگرانی کی اخلاقی و عملی تربیت کریں اور انہیں دینی تعلیم دلا کر جہنم کی آگ سے بچائیں، اللہ کے خاص بندوں کا یہ وصف بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ اپنی بیوی اور اولاد کے لیے یہ دعائے خیر کرتے ہیں کہ بارالٰہا! تو ان کے ظاہر و باطن کو سنوار کر، صورت و سیرت کی خوبی و پاکیزگی اور دین و دنیا کی بھلائی دے کر ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک بنا!

وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْیُنٍ (الفرقان ۲۵: ۷۴) اور جو دعا کرتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو ہماری بیویوں اور ہماری اولاد کی جانب سے آنکھوں کی ٹھنڈک بخش!

اس آیت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اولاد کو اچھی تعلیم و تربیت دے کر انہیں نیک اور سعادت مند بنانے کی فکر و کوشش کے ساتھ ان کی نیکی اور سعادت مندی کی دعا خدا سے کرنی چاہیے، ایک جگہ ارشاد ہوا ہے کہ نیک بندے، جس طرح اپنے والدین کی مغفرت کی دعا کرتے

ہیں اور ان کی خدمت کی توفیق چاہتے ہیں، اسی طرح وہ اپنی اولاد کے حق میں اپنی کوششوں کی کامیابی کی دعا بھی کرتے ہیں:

وَاَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ (احقاف ۴۶: ۱۵)
اور میری اولاد میں بھی میرے نیک بخت وارث اٹھا!

گویا اولاد کو صالح، سعید، کارآمد، مہذب اور تعلیم یافتہ بنانے کی دعا و تدبیر والدین کی ذمہ داری ہے، آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ ''باپ کا اپنے بچے کو کوئی ادب سکھانا ایک صاع صدقہ کرنے سے بہتر ہے، کوئی باپ اپنے بچے کو اس سے بہتر کوئی عطیہ نہیں دے سکتا کہ وہ اس کو اچھی تعلیم دے'' (۱)، یہاں بچے کا ذکر علی وجہ التغلیب آیا ہے ورنہ بچیاں بھی اس میں داخل ہیں جس کی صراحت دوسری حدیثوں میں موجود ہے، ایک روایت میں اس کی ممانعت کی گئی ہے کہ لڑکے اور لڑکی میں جنس کے اختلاف کی وجہ سے ترجیح دی جائے، فرمایا ''جس کے لڑکی ہو اور وہ اس کو زندہ باقی رہنے دے اور اس کی بے توقیری نہ کرے اور نہ اس پر لڑکے کو ترجیح دے تو خدا اس کو جنت میں داخل فرمائے گا''۔(۲)

اہل عرب لڑکیوں کو اپنے لیے بدشگونی اور مصیبت و بلا خیال کرتے تھے، قرآن مجید میں کئی جگہ ان کے اس تصور کا ذکر ہے، ایک جگہ ہے:

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ (نحل ۱۶: ۵۸، ۵۹)
اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی کی خوش خبری سنائی جاتی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ گھٹا گھٹا رہتا ہے، وہ اس منحوس خبر پر لوگوں سے چھپا چھپا رہتا ہے، سوچتا ہے کہ اسے ذلت کے ساتھ رکھ چھوڑے یا اس کو مٹی میں دفن کردے۔

لیکن نبوت محمدی نے اس بلا و مصیبت کو رحمت اور نجات اخروی کا ذریعہ بنادیا، ارشاد ہوتا ہے:

(۱) ترمذی، کتاب البر و الصلہ باب ادب الولد۔ (۲) سنن ابی داؤد، کتاب الادب باب فی فضل من عال یتامی، ص ۷۰۰۔

من بلی من هذه البنات شیئا فاحسن الیهن کن له سترا من النار (۱)
جو کوئی ان لڑکیوں کی مصیبت میں مبتلا ہوا اور پھر ان کے ساتھ محبت و مہربانی کا سلوک کرے تو وہ دوزخ کے عذاب سے اس کو بچالیں گی۔

صحیح مسلم میں ایک اور حدیث ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی ہی نہیں دوسروں کی لڑکیوں کی تعلیم و تربیت بھی باعث اجر و ثواب ہے:

من عال جاریتین حتی تبلغا جاء یوم القیامة انا وهو وضم اصابعه (۲)
جو دو لڑکیوں کی پرورش کرے یہاں تک کہ وہ جوان ہوجائیں تو قیامت میں میرا اور اس کا مرتبہ دو انگلیوں کو ملا کر فرمایا، یوں برابر ہوگا۔

ابوداؤد کی روایت ہے:

من عال ثلاث بنات فادبهن وزوجهن واحسن الیهن فله الجنة (۳)
جس نے تین لڑکیوں کی پرورش کی ان کو تعلیم و تربیت دی، ان کی شادی کی اور ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آیا تو اس کے لیے جنت ہے۔

لونڈیوں اور خادمات کے بارے میں بھی اسلام کی یہی تعلیم ہے کہ ان کو اچھی تعلیم دی جائے، بہتر تربیت کی جائے اور جو بہتر سے بہتر سلوک ہوسکتا ہو ان کے ساتھ کیا جائے:

رجل کانت عنده امة ...... فادبها فاحسن تادیبها و علمها فاحسن تعلیمها ثم اعتقها فتزوجها فله اجران (۴)
کسی آدمی کے لونڈی ہو اور وہ اس کو اچھا ادب سکھائے اور عمدہ تعلیم دے، پھر اسے آزاد کرکے اس کی شادی کردے تو اس کو دہرا اجر ملے گا۔

یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ اسلام نے صرف عورتوں کی دینی تعلیم ہی پر زور دیا ہے بلکہ انہیں ہر قسم کے علوم سیکھنے کی آزادی دی ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔

(۱) بخاری کتاب الادب باب رحمة الوالد و تقبیله، مسلم کتاب البر و الصله باب فضل الاحسان الی البنات۔ (۲) کتاب البر و الصله باب فضل الاحسان الی البنات۔ (۳) کتاب الادب باب فی فضل من عال یتامی، ص ۷۰۰۔ (۴) بخاری، کتاب العلم باب تعلیم الرجل امته و اهله، ص ۲۰، اصح المطابع۔

ابھی تک بعض کلیات و مقدمات سے عورتوں کی تعلیم کی ضرورت و اہمیت واضح کرنے کی کوشش کی گئی تھی، اب ہم ان میں تعلیم کے رواج کا ذکر کر کے دکھائیں گے کہ عہد رسالت اور اس کے بعد بھی عورتیں علمی و تعلیمی اور دینی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتی تھیں، تا کہ اس خیال کی کوئی گنجایش نہ رہے کہ عورتوں کا دائرہ کار گھر تک محدود ہے، علم و تعلیم سے بہرہ ور ہونا ان کے لیے ضروری نہیں ہے۔

مکہ معظمہ میں تعلیم کا رواج عہد نبوی سے کچھ پہلے ہوا، طویل عرصے تک عربی زبان صرف بولی جاتی تھی، ابوسفیان کے والد حرب کی ایک بیٹی کی شادی عراق کے مقام حیرہ میں ایک شخص سے ہوئی تھی، اسی نے انہیں بتایا کہ جن چیزوں کو بھول جانے کا اندیشہ ہو اور ان کو یاد رکھنا ضروری ہو، انہیں لکھ لیا کرو (۱)، بعض مورخین نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے عہد کے آغاز میں صرف سترہ اشخاص لکھنا پڑھنا جانتے تھے، جن میں ایک عورت شفا بنت عبداللہ عدویہ بھی تھیں (۲)، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام سے پہلے مکے میں عورتیں بھی پڑھنا لکھنا جانتی تھیں، شفا بنت عبداللہ نے اسلام قبول کر لیا تھا اور جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ آئیں تو ان کی تعلیم کی وجہ سے رسول اکرم ﷺ نے انہیں مدینہ کے ایک بازار میں کسی عہدہ پر مامور کیا تھا (۳)، ازواج مطہرات میں حضرت حفصہ وام سلمہ بھی لکھنا پڑھنا جانتی تھیں، حضرت حفصہ نے نبی ﷺ کے حکم سے شفا عدویہ سے نوشت وخواند کا فن سیکھا تھا (۴)، حضرت عائشہ کے بارے میں ایک روایت ہے کہ وہ پڑھ لیتی تھیں مگر انہیں لکھنا نہیں آتا تھا لیکن دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک خط کا جواب خود تحریر فرمایا تھا۔ (۵)

ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مکے میں جب سے قرأت اور تحریر و کتابت کا آغاز ہوا ہے، اسی وقت سے مردوں کی طرح عورتیں بھی تعلیم حاصل کرنے لگی تھیں، آنحضرت ﷺ نے اس کو نہ صرف باقی رکھا بلکہ اس کی ہر طرح حوصلہ افزائی بھی فرمائی، ہجرت کر کے آپ ﷺ مدینہ تشریف

(۱) ڈاکٹر حمید اللہ، خطبات بہاول پور، ص ۲۲۵، ۲۲۶، اسلامیہ یونی ورسٹی بہاول پور، ۱۴۰۱ھ (۲) فتوح البلدان بلاذری، ص ۴۷۷، مطبوعہ قاہرہ مصر، ۱۳۱۹ھ / ۱۹۰۱ء (۳) خطبات بہاول پور ص ۲۲۶ (۴) فتوح البلدان بلاذری، ص ۴۷۷ (۵) خطبات بہاول پور اور سیر الصحابیات، مولانا سعید انصاری، مطبوعہ معارف پریس، اعظم گڈھ۔

لائے تو صفہ کا مدرسہ قائم ہوا، جس کے ایک استاذ لکھنا پڑھنا دونوں جانتے تھے اور وہ طالب علموں کو صرف خطاطی کی مشق کراتے تھے، اس درس گاہ میں تعلیم کے ساتھ تربیت کا بھی انتظام تھا اور اس میں تعلیم پانے والوں میں اکثر کی رہایش گاہ بھی یہی تھی، اس لحاظ سے اس کو اقامتی درس گاہ کہہ سکتے ہیں۔

صفہ کی تعلیم گاہ میں مردوں کی طرح عورتوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام تھا، اس وقت مدینہ منورہ میں ۹ مسجدیں تھیں اور ہر مسجد درس گاہ بھی تھی جس میں بچوں کے ساتھ بچیاں بھی زیر تعلیم رہتی تھیں، آپ ﷺ نے لوگوں کو حکم دیا کہ اپنے محلہ کی مسجدوں میں اپنے ہمسایوں سے تعلیم حاصل کرو!

بدر کی لڑائی میں جو قیدی آپ کو ہاتھ تھے ان کی رہائی کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ قیدیوں میں سے جو پڑھنا لکھنا جانتے ہوں، وہ دس دس مسلمان بچوں بچیوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں، یہ واقعہ اس کا بھی ثبوت ہے کہ علم و فن کی تحصیل میں مسلم وغیر مسلم کی تمیز اسلام نے روا نہیں رکھی ہے۔ (۱)

عہد نبوی میں تعلیم و تعلم کا رجحان بڑھا تو مرد اور عورتیں دونوں حصول علم میں نہایت سرگرم رہتے تھے، ہر ایک اپنی علمی و تعلیمی استعداد بڑھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا بلکہ بعض واقعات تو ایسے ملتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ دین کے احکام و مسائل معلوم کرنے کے لیے عورتیں نہایت بے چین رہتی تھیں، مسجد نبوی میں آپ ﷺ کا وعظ و ارشاد ہوتا تو مردوں کی طرح وہ بھی اس میں شریک ہوتی تھیں، ان کا ذوق و شوق دیکھ کر رسول اللہ ﷺ نے ان کے لیے وعظ و ارشاد کا مخصوص انتظام بھی فرما دیا تھا، امام بخاریؒ نے کتاب العلم میں یہ روایت نقل کی ہے کہ عورتوں نے آنحضرت ﷺ سے درخواست کی کہ ہمارے لیے وعظ و ارشاد کا ایک خاص دن مقرر فرما دیا جائے، آپ نے ان کی یہ درخواست منظور فرمائی اور ان کے وعظ و ارشاد کا ایک خاص دن مقرر فرما دیا۔ (۲)

عورتیں بارگاہ نبوی میں حاضر ہو کر استفسارات بھی کرتی تھیں تا کہ ان کے علم و واقفیت میں اضافہ ہو، حضرت عائشہ انصار کی عورتوں کے اس طرز عمل کا ذکر بڑی پسندیدگی سے کرتی ہیں کہ:

(۱) یہ ساری تفصیل خطبات بہاول پور اور عہد نبوی کا نظام تعلیم میں درج ہے (۲) صحیح بخاری، کتاب العلم باب هل يجعل للنساء يوم على حدة فى العلم، ج ۱، ص ۲۰، ۲۱

نعم النساء نساء الانصار لم یکن یمنعهن الحیا ان یتفقهن فی الدین (۱)

انصار کی عورتیں کتنی اچھی ہیں، وہ شرم و حیا کی وجہ سے دین میں فقہ و بصیرت حاصل کرنے سے باز نہیں رہتیں۔

عورتیں نہایت دلیری کے ساتھ آپ سے بے محابا مسائل دریافت کرتی تھیں اور صحابہ کو ان کی اس جرأت پر بڑی حیرت ہوتی تھی کہ کہیں نبی کریم ﷺ کو ناگواری نہ ہو جائے مگر آپ ﷺ ان کی برأت و بے باکی پر کسی قسم کی ناگواری نہیں ظاہر فرماتے تھے، خواتین کے علمی شغف، غیر معمولی شوق اور وقت نظر کا اندازہ حضرت عائشہؓ کے اس ارشاد سے ہوتا ہے:

کانت تنزل علینا الآیة فی عهد رسول الله نحفظ حلالها و حرامها و آمرها و زاجرها (۲)

رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں کوئی آیت کریمہ نازل ہوتی تو ہم اس کے حلال و حرام اور اوامر و نواہی کو یاد کر لیتی تھیں اور سمجھ لیتی تھیں۔

مورخین و ارباب سیر نے اس قسم کے واقعات ضمناً لکھے ہیں، تلاش و تفحص سے کام لیا جائے تو خود احادیث سے اس کی مزید مثالیں مل سکتی ہیں، ان واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ عہد نبویؐ میں عورتیں علم کے حصول میں منہمک رہتی تھیں اور وہ دین کے اوامر و احکام معلوم کرنے کی فکر میں رہتی تھیں اور اپنی علمی تشنگی بجھانے کے لیے آنحضرت ﷺ سے برابر سوالات و استفسارات کرتی رہتی تھیں، یوں تو عہد نبویؐ میں اکثر خواتین خصوصاً ازواج مطہرات کو علم سے اشتغال رہا ہے لیکن حضرت عائشہ صدیقہ اس حیثیت سے سب میں ممتاز اور فائق تھیں، اس لیے پہلے ہم کسی قدر تفصیل سے ان کی علمی فضیلت و برتری کا ذکر کرتے ہیں۔

حضرت خدیجہؓ کے بعد حضرت عائشہؓ ازواج مطہرات میں رسول اللہ ﷺ کو سب سے محبوب تر تھیں، مولانا شبلی لکھتے ہیں:

"لیکن محبت کے اسباب وہ نہ تھے جو عام انسانوں میں پائے جاتے ہیں، حسن صورت میں حضرت صفیہؓ ان سے بڑھ کر تھیں اور دوشیزہ بھی تھیں دیگر

(۱) صحیح بخاری، کتاب العلم باب الحیا فی العلم ص ۲۴ و صحیح مسلم کتاب الحیض باب استعمال المغتسلة، ج ۱ ص ۱۳۷ مطبوعہ مصر بدون سن (۲) العقد الفرید بہامشہ زہر الآداب، ج ۱ ص ۱۴۸ مصر ۱۳۱۶ھ

ظاہری محاسن میں بھی دیگر ازواج ان سے کم نہ تھیں لیکن حضرت عائشہؓ کی قابلیت، ذہانت، قوت اجتہاد، وقت نظر، وسعت معلومات ایسے اوصاف تھے جو ان کی ترجیح کا اصلی سبب تھے"۔(۱)

حضرت عائشہؓ کی یہ ترجیح عام ازواج مطہرات کے لیے تکدر اور ناگواری کا سبب بن گئی تھی، ایک دفعہ انہوں نے حضرت فاطمہؓ کو اپنا وکیل بنا کر بھیجا کہ "آپ ابوبکر کی بیٹی کو ہم پر کیوں ترجیح دیتے ہیں" وہ اپنی سفارت میں ناکام رہیں تو اس کے لیے حضرت زینبؓ کا انتخاب عمل میں آیا جن کو خصوصیت کے ساتھ حضرت عائشہؓ کی ہمسری کا دعوا تھا، انہوں نے یہ پیغام بڑی دلیری سے ادا کیا اور بڑے زور کے ساتھ ثابت کرنا چاہا کہ حضرت عائشہؓ اس رتبہ کی مستحق نہیں ہیں، حضرت عائشہؓ چپ سن رہی تھیں، آپ کی مرضی پا کر کھڑی ہوئیں اور اس زور و شور کے ساتھ تقریر کی کہ حضرت زینبؓ لاجواب ہو کر رہ گئیں۔(۲)

حضرت عائشہؓ کی خوش بیانی اور فصیح الکلامی مشہور ہے، وہ بلند پایہ اور خوش بیان خطیب تھیں، ان کے شاگردوں کا بیان ہے کہ ہم نے ان سے زیادہ کسی کو خوش تقریر نہیں دیکھا، فصاحت و بلاغت میں یکتا تھیں، موسیٰ بن طلحہ کہتے ہیں میں نے ان سے بڑا کوئی فصیح الکلام نہیں دیکھا، تفسیر، حدیث، اسرار شریعت، خطابت اور ادب و انساب میں ان کو کمال حاصل تھا، شعرا کے بڑے بڑے قصیدے ان کو زبانی یاد تھے، حضرت ہشام بن عروہؓ کا بیان ہے کہ میں نے قرآن، علم فرائض، حلال و حرام، فقہ، شعر، طب، عرب کی تاریخ و نسب کا ام المومنین حضرت عائشہؓ سے بڑا عالم کسی کو نہیں دیکھا (۳)، وہ سب سے بڑی عالمہ و فقیہہ تھیں، بڑی زیرک، معاملہ فہم اور مغز سخن تک پہنچ جانے والی تھیں، مشہور تابعی عطا بن ابی رباح سے روایت ہے کہ "عائشہؓ سب سے زیادہ فقیہ، سب سے زیادہ صاحب علم اور سب سے زیادہ اچھی رائے والی تھیں"۔(۴)

وہ کثیر الروایت صحابہ کرام میں تھیں، ان کی روایتوں کی تعداد ۲۲۱۰ ہے (۵)، بعض لوگوں

(۱) سیرۃ النبی، ج ۲، ص ۳۴۵ بڑی تقطیع۔ (۲) مستدرک حاکم، ج ۴، ص ۱۳۔ (۳) مستدرک حاکم، کتاب معرفة الصحابه ذکر عائشہ، ج ۴، ص ۹ تا ۱۴، دائرۃ المعارف النظامیہ حیدر آباد، ۱۳۴۲ھ (۴) محمد بن سعد: الطبقات الکبیر قسم ثانی جز ثانی، ص ۱۲۶، مطبع بریل لیڈن۔ (۵) مولانا سید سلیمان ندوی: سیرت عائشہ، ص ۱۹۲، طبع یازدہم۔

کا قول ہے کہ احکام شرعیہ میں سے ایک ثلث یا چوتھائی ان سے منقول ہے، غرض علمی حیثیت سے ان کا پایہ نہایت بلند تھا، وہ عام عورتوں اور ازواج مطہرات ہی پر نہیں چند بزرگ صحابہ کو چھوڑ کر تمام صحابہ کرام پر بھی فوقیت رکھتی تھیں، اسی لیے صحابہ کرام کے سامنے جب کوئی مشکل سوال پیش آجاتا تو اس کو حضرت عائشہؓ ہی حل کرتی تھیں، حضرت ابوموسیٰ اشعری سے روایت ہے کہ ہم اصحاب رسول کو کوئی ایسی مشکل بات پیش نہیں آئی جس کو ہم نے عائشہؓ سے پوچھا ہو اور ان کے پاس اس کے متعلق معلومات ہم کو نہ ملی ہوں (۱) امام زہری ارشاد فرماتے ہیں" وہ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ عالم تھیں، بڑے بڑے صحابہ ان سے مسائل دریافت کرتے تھے"۔ (۲)

تفقہ و اجتہاد میں عورتیں تو درکنار مردوں سے بھی وہ علانیہ ممتاز تھیں، ان کے علمی کمالات، احادیث میں دقت نظر، تفقہ و اجتہاد میں مہارت، احکام دین سے واقفیت اور مغز سخن تک رسائی حاصل کرلینے کا اندازہ ان کے استدراکات سے بہ خوبی ہوتا ہے، جن کو علامہ سیوطی نے "عین الاصابہ فما استدرکتہ عائشہ علی الصحابہ" کے نام سے ایک مجموعہ میں جمع کردیا ہے، ذیل میں اس کی بعض مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

۱- حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا "نحوست تین چیزوں میں پائی جاتی ہے، عورت میں، گھوڑے میں اور گھر میں"، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں "یہ صحیح نہیں، ابوہریرہ نے آدھی بات سنی اور آدھی نہیں سنی"، آپ پہلا فقرہ فرما چکے تھے کہ ابوہریرہؓ پہنچے، آپ نے دراصل یہ فرمایا تھا کہ یہود کہتے ہیں کہ بدشگونی تین چیزوں میں ہے، عورت میں، گھوڑے میں اور گھر میں۔ (۳)

۲- غزوۂ بدر میں جو کفار مارے گئے تھے، آنحضرت ﷺ نے ان کے مدفن پر کھڑے ہوکر فرمایا "هل وجدتم ما وعد ربکم حقا" (خدا نے تم سے جو وعدہ کیا تھا تم نے اس کو سچا پایا) حضرت عمرؓ نے عرض کی یارسول اللہ! آپ مردوں کو پکارتے ہیں، آپ نے فرمایا "ما انتم باسمع منهم ولکن لا یجیبون" (وہ تم سے زیادہ سنتے ہیں لیکن جواب نہیں دے سکتے)، حضرت عائشہؓ سے جب یہ روایت بیان کی گئی تو انہوں نے فرمایا آپ نے یہ نہیں بلکہ یہ ارشاد فرمایا تھا "انهم

(۱) جامع ترمذی، ابواب المناقب من فضل عائشه، ج ۲، ص ۲۲۷، کتب خانہ رشیدیہ۔ (۲) محمد بن سعد: الطبقات الکبیر، قسم ثانی جزء ثانی، ص ۱۲۶، مطبع بریل لیڈن، ۱۳۰۰ھ۔ (۳) مسند ابوداؤد طیالسی، مسند عائشہ۔

لیعلمون الآن ان ما کنت اقول لهم حق" (وہ اس وقت یقینی طور سے جانتے ہیں کہ میں نے ان سے جو کچھ کہا تھا وہ سچ تھا)، پھر ام المومنین نے یہ آیت تلاوت کی:

فَاِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی (الروم ۳۰:۵۲)　تم مردوں کو اپنی پکار نہیں سنا سکتے

نیز فرمایا:

وَمَا اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِی الْقُبُوْرِ (فاطر ۳۵:۲۲)　اور تم ان کو سنانے والے نہیں بن سکتے جو قبروں کے اندر ہیں۔

یہ واقعہ صحیح بخاری کتاب العلم ص ۲۱ میں مذکور ہے۔

۳- حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ان المیت لیعذب ببکاء اهله علیه　مردہ پر اس کے گھر والوں کے رونے سے عذاب ہوتا ہے۔

حضرت عائشہؓ نے روایت تسلیم کرنے سے انکار نہیں کیا بلکہ فرمایا کہ ابن عمر نے آپ کی بات نہیں سمجھی، واقعہ یہ ہے کہ آپ ایک روز ایک یہودی عورت کے جنازے سے گزرے، اس کے رشتہ دار اس پر واویلا کررہے تھے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا "یہ روتے ہیں اور اس پر عذاب ہو رہا ہے"، حضرت عائشہؓ کا مقصد یہ تھا جیسا کہ بخاری میں تصریح ہے کہ رونا عذاب کا سبب نہیں بلکہ وہ عورت اپنے گزشتہ اعمال بد کی وجہ سے مبتلائے عذاب ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (فاطر ۳۵:۱۸)　اور کوئی جان کسی دوسری جان کا بوجھ اٹھانے والی نہیں بنے گی۔ (۱)

۴- ایک روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے دوبار خدائے عزوجل کو دیکھا، مسروق تابعی نے حضرت عائشہ سے جاکر پوچھا مادرمن! کیا محمد ﷺ نے خدا کو دیکھا، حضرت عائشہ نے کہا تم نے ایسی بات کہی جس کو سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے، جو تم سے یہ کہے کہ محمد ﷺ نے خدا کو دیکھا وہ جھوٹ کہتا ہے، پھر یہ آیت پڑھی:

لَا تُدْرِکُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ　اللہ کو نگاہیں نہیں پاتیں لیکن وہ نگاہوں کو پالیتا

(۱) دیکھیے صحیح بخاری و مسلم کتاب الجنائز۔

یدرک الابصار و ھو اللطیف الخبیر (انعام ۶:۱۰۳) — ہے، وہ بڑا باریک بین اور بڑا باخبر ہے۔

اس کے بعد دوسری آیت پڑھی:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ (الشوریٰ ۴۲:۵۱) — اور کسی بشر کی بھی یہ شان نہیں ہے کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر وحی کے ذریعہ سے یا پردے کی اوٹ سے۔

۵- متعہ یعنی ایک مدت معین کا نکاح، جاہلیت اور ابتدائے اسلام میں جائز تھا، خیبر میں اس کی حرمت کا اعلان کیا گیا، اس کے بعد بھی حضرت ابن عباسؓ وغیرہ بعض صحابہ اس کے جواز کے قائل تھے لیکن جمہور صحابہ اس کی حرمت کے قائل ہیں اور اپنے دعوا کی توثیق میں حدیثیں پیش کرتے ہیں، حضرت عائشہؓ سے اس کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے اس کا جواب حدیثوں سے نہیں دیا بلکہ فرمایا میرے اور تمہارے درمیان خدا کی کتاب ہے، پھر یہ آیت پڑھی:

وَالَّذِيْنَ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ (المعارج ۷۰:۲۹،۳۰) — اور وہ جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں بجز اپنی بیویوں اور لونڈیوں کے حد تک، سو اس باب میں ان کو کوئی ملامت نہیں۔

اور آخر میں فرمایا کہ ان دو صورتوں کے علاوہ اور کوئی صورت جائز نہیں۔

۶- حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ناجائز لڑکا تینوں (ماں، باپ، بچہ) میں بدتر ہے، حضرت عائشہؓ نے سنا تو فرمایا یہ صحیح نہیں ہے، واقعہ یہ ہے کہ ایک شخص منافق تھا، آپ کو برا بھلا کہتا تھا، لوگوں نے عرض کی کہ یارسول اللہ ﷺ! اس کے علاوہ وہ ولد الزنا بھی ہے، آپ نے فرمایا کہ وہ تینوں میں بدتر ہے یعنی اپنے ماں باپ سے زیادہ برا ہے، یہ ایک خاص واقعہ تھا، عام نہ تھا، خدا فرماتا ہے وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی، کوئی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا، یعنی قصور ماں باپ کا ہے بچے کا کیا گناہ ہے؟ (۱)

۷- صحاح کی متعدد کتب میں یہ منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو بکری کے دست کا گوشت بہت پسند تھا، حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ دست کا گوشت فی نفسہ پسند نہ تھا بلکہ بات یہ تھی کہ گوشت

(۱) اصابہ، سیوطی، بحوالہ حاکم۔

روز نہیں ملتا تھا، دست کا گوشت پکنے میں جلد گل جاتا ہے اس لیے آپ اس کو پسند کرتے تھے۔ (۱)

۸- حضرت سعد بن وقاصؓ نے وفات پائی تو ام المومنین حضرت عائشہؓ نے چاہا کہ مسجد میں ان کا جنازہ آئے تو وہ بھی نماز پڑھ لیں، لوگوں نے اعتراض کیا تو فرمایا لوگ کس قدر جلد بات بھول جاتے ہیں، آنحضرت ﷺ نے سہیل بن بیضا کے جنازہ کی نماز مسجد ہی میں پڑھی تھی۔ (۲)

طوالت کے خوف سے مزید مثالیں قلم انداز کی جاتی ہیں۔

آنحضرت ﷺ کے جن ارشادات وفرمودات سے حضرت عائشہؓ کو تشفی نہیں ہوتی تھی، ان کو بے تامل آپ کے سامنے پیش کر دیتی تھیں اور جب تک تسلی نہ ہوتی خاموش نہیں رہتی تھیں، ایک دفعہ آپ نے فرمایا "مَنْ حُوْسِبَ عُذِّبَ" (قیامت میں جس کا حساب ہوا، اس پر عذاب ہو گیا)، حضرت عائشہؓ نے عرض کی یارسول اللہ! خدا تو فرماتا ہے:

فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا (انشقاق ۸۴:۸) — اس سے آسان حساب کیا جائے گا۔

آپ نے فرمایا یہ اعمال کی پیشی ہے لیکن جس کے اعمال میں جرح وقدح ہوئی وہ تو برباد ہوا۔ (۳)

نکاح میں رضامندی شرط ہے لیکن کنواری لڑکیاں اپنے منھ سے آپ رضامندی نہیں ظاہر کرتیں، اس لیے حضرت عائشہؓ نے دریافت کیا یارسول اللہ! نکاح میں عورت سے اجازت لینی چاہیے؟ فرمایا "ہاں" عرض کی کہ وہ شرم سے چپ رہتی ہے، ارشاد ہوا کہ "خموشی ہی اس کی اجازت ہے"۔ (۴)

آنحضرت ﷺ بھی ان کی خاص طور پر نگرانی فرماتے تھے اور ان کی تعلیم وتربیت کا پورا لحاظ رکھتے تھے، ان سے کسی قسم کی کوتاہی ہوتی تھی تو فوراً آپ ان کی تنبیہ فرماتے تھے، ایک دفعہ آپ کی خدمت میں چند یہودی آئے اور السلام علیک کے بجائے زبان دبا کر السام علیک کہا، آپ نے جواب میں فرمایا "وعلیکم" حضرت عائشہؓ سے ضبط نہ ہوا، بولیں علیکم السام واللعنۃ، ارشاد ہوا عائشہ نرمی چاہیے، خدائے عز وجل ہر بات میں نرمی پسند کرتا ہے۔ (۵) (باقی)

(۱) شمائل ترمذی۔ (۲) صحیح مسلم کتاب الجنائز۔ (۳) صحیح بخاری، کتاب العلم، ص ۲۱۔ (۴) صحیح مسلم، کتاب النکاح۔ (۵) صحیح بخاری باب الرفق فی الامر کلہ، ص ۸۹۰۔

استدراک

از:- جناب وارث ریاضی صاحب☆

معارف دسمبر ۲۰۰۵ء کے شمارے میں ڈاکٹر سید عبدالباری صاحب نے ''علامہ شبلی نعمانیؒ کی انفرادیت اور امتیازات'' پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، ڈاکٹر صاحب کے اس گراں قدر مقالے کے اس حصے سے مجھے اتفاق نہیں ہے، جس میں انہوں نے حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ العزیز پر وطنی قوم پرستی کا الزام عاید کرتے ہوئے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ مولانا مدنیؒ کے نزدیک اسلامی قومیت کی اساس دین پر نہیں بلکہ نسل و وطن پر ہے، جب کہ ہندوستانی علما میں علامہ شبلیؒ، مولانا محمود حسنؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا محمد علی جوہرؒ، ڈاکٹر اقبالؒ اور مولانا ابوالکلام آزادؒ کے نزدیک ''اسلامی قومیت'' کا مدار دین پر ہے، اتحاد نسل و وطن پر نہیں۔

مولانا حسین احمد مدنیؒ کی کتاب ''متحدہ قومیت اور اسلام'' کے جواب میں مولانا مودودیؒ کی تصنیف ''مسئلہ قومیت'' کا حوالہ دیتے ہوئے ڈاکٹر سید عبدالباری رقم طراز ہیں:

''مولانا مودودی نے اس رسالے کے جواب میں اپنا بسیط مقالہ بہ عنوان ''مسئلہ قومیت'' لکھا، انہوں نے مولانا کو آگاہ کیا کہ مسلمانوں کی وحدت ملی کی حمایت میں ٹیپو سلطان، جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبدہ، مصطفی کامل مصری، امیر شکیب ارسلان، انور پاشا، شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، محمود حسن، محمد علی، اقبال و ابوالکلام نے نسلی، وطنی اور لسانی بتوں کی پرستش سے دور رہنے کا مطالبہ کیا''۔ (معارف دسمبر ۲۰۰۵ء، ص ۴۱۳)

مولانا حسین احمد مدنی کو قرآن، حدیث اور فقہ کے علوم میں پورا رسوخ حاصل تھا، اسلامی تاریخ اور عالمی سیاست پر ان کی بہت گہری نظر تھی، عمل بالسنۃ میں تو ان کے معاصرین میں ان کی نظیر نہیں ملتی، مولانا اس حقیقت سے پوری طرح واقف تھے کہ اسلامی قومیت کی اساس دین

☆ کاشانۂ ادب سکلا دیوراج، ڈاک خانہ بسوریا وایا لوریا، مغربی چمپارن، بہار۔

پر ہے، اتحاد نسل یا اتحاد وطن پر نہیں، ''قومیں اوطان سے بنتی ہیں'' یہ ان کا سیاسی نصب العین نہیں تھا جیسا کہ ان کے ناقدین سمجھتے ہیں، مولانا کو ''رموز دین'' یا مسلمانوں کی ''وحدت ملی'' کی اہمیت سے آگاہ کرنا، آفتاب کو چراغ دکھانے سے کچھ زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

مولانا مدنی نے ہندوستان کی آزادی کی راہ میں حائل طوفانوں کا نظارہ ہندوستان کے بعض ارباب فکر و نظر کی طرح ساحل سے نہیں بلکہ موجوں میں گھس کر کیا تھا، اس لیے مولانا کے نزدیک انگریزوں کے تسلط سے ہندوستان کو آزاد کرانے کا بس ایک ہی راستہ تھا' ہندو مسلم اشتراک عمل کا راستہ۔

مولانا مدنی نے اپنی کتاب ''متحدہ قومیت اور اسلام'' میں استخلاص وطن کے لیے ہندو مسلم اتحاد عمل کو شرعی طور پر جائز قرار دے کر حصول آزادی کے لیے راستہ ہموار کیا ہے، اس کتاب کی تصنیف کا مقصد معاذ اللہ یہ نہیں کہ مسلمان اپنے ملی امتیازات کو مٹا کر خود کو ہندو قومیت میں ضم کر لیں۔

مولانا حسین احمد مدنی نے جمعیت علمائے ہند کے اجلاس منعقدہ جون پور میں اپنے خطبہ صدارت میں ''متحدہ قومیت'' کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا تھا:

''ہم سب وطنی حیثیت سے ہندوستانی ہیں اور وطنی منافع کے حصول اور مضرات کے ازالے کا فکر اور اس کے لیے جدوجہد مسلمانوں کا بھی اسی طرح فریضہ ہے جس طرح دوسری ملتوں اور غیر مسلم قوموں کا، اس کے لیے سب کو مل کر پوری طرح کوشش کرنی از بس ضروری ہے، اگر آگ لگنے کے وقت تمام گاؤں کے باشندے آگ نہ بجھائیں گے، سیلاب آنے کے وقت تمام گاؤں کے بہنے والے بند نہ باندھیں گے تو تمام گاؤں برباد ہو جائے گا اور سبھی کے لیے زندگی وبال ہو جائے گی، اسی طرح ایک ملک کے باشندوں کا فرض ہے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، سکھ ہوں یا پارسی کہ ملک پر جب کوئی عام مصیبت پڑ جائے تو مشترکہ قوت سے اس کو دور کرنے کی جدوجہد کریں، اس اشتراک وطنی کے سب پر یکساں فرائض عائد ہوتے ہیں، مذاہب کے اختلاف سے اس میں کوئی رکاوٹ یا کم زوری نہیں ہوتی، ہر ایک مذہب پر پوری طرح قائم رہ کر ایسے فرائض انجام دے سکتا ہے، یہی اشتراک میونسپل بورڈوں، ڈسٹرکٹ بورڈوں، کونسلوں

اور اسمبلیوں میں پایا جاتا ہے اور مختلف المزاہب ممبر فرائض شہر یا ضلع یا صوبہ یا ملک کو انجام دیتے ہیں اور اس کو ضروری سمجھتے ہیں، یہی معنی اس جگہ ''متحدہ قومیت'' کے ہیں، اس کے علاوہ دوسرے معنی جو لوگ سمجھ رہے ہیں وہ غلط ہیں، یورپین لوگ ''قومیت متحدہ'' کے جو معنی مراد لیتے ہیں اور جو کانگریسی اشخاص انفرادی طور پر معانی بیان کرتے ہیں، ان سے جمعیت علما بےزاری اور تبری کرنے والی ہے''۔ (ص ۴۵، ۴۶ بہ حوالہ ''الرشید'' کا مدنی و اقبال نمبر، ص ۲۱۸)

علاوہ ازیں مولانا حسین احمد مدنی نے اپنے مکتوب بہ نام ڈاکٹر اقبال میں بھی اس بات کو واضح کردیا تھا کہ یورپ کا نظریہ وطن ان کا سیاسی نصب العین نہیں ہے، اس کے باوجود مولانا مدنی پر وطن پرستی کا الزام عائد کیا جاتا ہے، حالاں کہ یہ نظریہ ان کا کوئی خودساختہ نظریہ نہیں تھا بلکہ یہ وہی نظریہ تھا جسے ہندوستانی علما اور ارباب فکر و نظر جہد آزادی کے مختلف مراحل میں اپنے اپنے انداز میں پیش کرچکے تھے۔

۱۹۱۲ء میں علامہ شبلی نعمانی نے مسلم گزٹ (لکھنؤ) کے لیے ''مسلمانوں کی پولیٹکل کروٹ'' کے عنوان سے کئی قسطوں میں مضمون لکھا تھا، اس میں علامہ نے ہندو مسلم سیاسی اشتراک عمل پر اہل وطن کی توجہ دلائی تھی اور نواب وقارالملک بہادر کے اس خیال سے کہ:

''اگر ہندوستانی مسلمان کانگریس میں شرکت کریں گے تو ان کی ہستی فنا ہوجائے گی''۔

علامہ نے اختلاف کیا تھا اور اپنا ردعمل یوں ظاہر کیا تھا:

''اگر پارسیوں کی قوم ایک لاکھ کی جماعت کے ساتھ ہندوؤں کے ۱۹ کرور اور مسلمانوں کے پانچ کرور افراد کے مقابلے میں اپنی ہستی قایم رکھ سکتی ہے، اگر دادا بھائی نوروز جی تمام ہندوستان کے مقابلے میں سب سے پہلے پارلیمنٹ کا ممبر ہوسکتا ہے، اگر گوکھلے تنہا ریفارم اسکیم کی عظیم الشان تحریک کی بنیاد ڈال سکتا ہے تو ۵ کرور مسلمانوں کو اپنی ہستی کے مٹ جانے کا اندیشہ نہیں کرنا چاہیے''۔ (حیات شبلی، ص ۶۱۵)

نومبر ۱۹۲۰ء میں جمعیت علمائے ہند کا دوسرا اجلاس دہلی میں ہوا تھا، اس اجلاس میں ہندوستان کے پانچ سو علمانے شرکت کی تھی، اجلاس کی صدارت شیخ الہند مولانا محمود حسن کو کرنا تھی لیکن وہ اپنی شدید علالت کی وجہ سے شریک نہیں ہوسکے، شیخ الہند کی طرف سے جو خطبہ صدارت

پیش کیا گیا اس میں انہوں نے آزادی وطن کے لیے ہندو مسلم اشتراک عمل کو بہت ہی مفید اور نتیجہ خیز بتایا تھا۔ (نقش حیات، ج ۲، ص ۲۶۰)

قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم نے لکھا ہے کہ ہندوستان میں ایک متحدہ جمہوری حکومت کے قیام کا تخیل مولانا محمود حسن نے پیش کیا تھا اور مولانا سید حسین احمد مدنی کی ''متحدہ قومیت'' میں مولانا محمود حسن کے سیاسی موقف کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، قاضی صاحب رقم طراز ہیں:

''افسوس ہے کہ مولانا (محمود حسن) کے حالات پر تاریخ نے پردہ ڈال رکھا ہے اور آپ کی انقلابی تحریکات کے بارے میں اگر کچھ معلوم ہے تو صرف اتنا کہ یاغستان میں مولانا نے جہاد کی مہم چلائی جس کا تذکرہ اس سے پہلے آچکا ہے اور ہندوستان میں ایک مجوزہ جمہوریہ کا نقشہ پیش کیا جس کا صدر راجہ مہندر پرتاپ کو بنایا جو ایک بڑے انقلابی تھے اس سے ان کے زندگی کے اصولوں کی جانب تو رہنمائی ہوتی ہے لیکن تفصیلات کا پتہ نہیں چلتا، مجوزہ جمہوریہ کی تاریخی حقیقت تو گورنمنٹ آف انڈیا کے سابق وزیر داخلہ سر ولیم ونسنٹ نے، اس کا مضحکہ اڑا کر محفوظ کردی، سنٹرل کونسل میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے مجوزہ جمہوریہ کے بارے میں کہا کہ جواب بھی مجوزہ ہی ہے، افسوس سر ولیم ونسنٹ زندہ نہیں ہیں ورنہ وہ دیکھ لیتے کہ وہ مجوزہ جمہوریہ اب حقیقت بن چکی ہے یہ تو ہندوستان کے اندر مولانا کے سیاسی موقف کی نشان دہی ہے، جس کو زیادہ تفصیل کے ساتھ ان کے شاگرد رشید مولانا حسین احمد مدنی نے ''متحدہ قومیت'' کے عنوان سے ایک کتابچہ میں بیان کیا ہے، اور علامہ اقبال نے اسی سے غلط فہمی میں مبتلا ہوکر ان پر طعن کیا، بحثیں ہوئیں اور آخر کار علامہ اقبال کو ماننا پڑا کہ وہ غلط فہمی کے شکار ہوئے تھے، اس ضمن میں علامہ اقبال سہیل نے جواب میں قطعے اور نظمیں فارسی میں لکھیں، افسوس ہے کہ ان سب کے بیان کی یہاں گنجائش نہیں، اتنا کافی ہے کہ مولانا کی وہ ذات تھی جنہوں نے بہت پہلے نہ صرف ہندوستان میں مشترکہ جمہوریہ کے قیام کا خواب دیکھا، بلکہ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے دار و رسن کو دعوت دی''۔ (تحریک خلافت ص ۴۲۔۴۳)

عالم اسلام کے عظیم عالم و محقق حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے نزدیک بھی آزادی وطن کے لیے ہندو، مسلم، اشتراک ''متحدہ قومیت'' کی تشکیل جائز تھی جمعیت علمائے ہند کا

ساتواں اجلاس مارچ ۱۹۲۶ء میں سید صاحبؒ کی صدارت میں بمقام کلکتہ ہوا تھا، سید صاحبؒ نے اپنے صدارتی خطبے میں تحریر فرمایا تھا:

''ہندوستان کے ہر طبقہ کے مسلمانوں کو یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیے کہ آیندہ ہندوستان کی جو شکل وصورت بھی ہو، بہ ہر حال یہاں کی حکومت اسلامی نہ ہوگی، بہتر سے بہتر جو صورت خیال میں آسکتی ہے وہ ایک ''متحدہ جمہوریت'' کی ہے''۔ (حیات سلیمان ص ۲۴۱)

حضرت سید صاحبؒ نے معارف اپریل ۱۹۴۲ میں مسلمانوں کے تصور آزادی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا تھا:

''فرض کیجیے کہ دنیا کے کسی گوشے میں مسلمانوں کی ایک سلطنت کا اضافہ ہوگیا تو کیا اس سے اسلام کا پیام زندہ ہوجائے گا، اس سے مسلمان پھر مسلمان ہوجائیں گے؟ زیادہ سے زیادہ جو خوش کن خواب نظر آسکتا ہے وہ یہ ہے کہ ہم کو ایک اور طویل وعریض عراق یا شام یا مصر مل جائے گا تو کیا اس سے اسلام کی بے کسی اور غربت میں کچھ بھی کمی ہوسکتی ہے؟'' (حیات سلیمان ص ۵۴۹)

اہل علم یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ علامہ اقبالؒ سے گہرے مراسم کے باوجود قومیت کے مسئلے میں سید صاحبؒ نے حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے نقطۂ نظر کی حمایت کی تھی، سید صاحبؒ نے اپنے مضمون بہ عنوان ''قوم ووطن'' میں لکھا تھا:

''ان اوپر کی سطروں کی بنا پر ڈاکٹر (اقبال) صاحب کی پیش نظر قوم، ملت اور امت کی جو تشریح ہے وہ فلسفیانہ اصطلاحوں میں صحیح ہوتو ہو مگر قرآن کے لفظوں میں میرے خیال میں صحیح نہیں''۔ (متحدہ قومیت علمائے اسلام کی نظر میں ص ۱۵)

جمعیت علمائے ہند کا آٹھواں اجلاس پشاور دسمبر ۱۹۲۷ء میں فخر المحدثین علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی صدارت میں ہوا تھا، حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے خطبۂ صدارت میں یہود مدینہ کے ساتھ رسول ﷺ کے معاہدہ کے ۱۹؍دفعات نقل کرکے آزادی وطن کے سلسلے میں مسلمانوں اور غیر مسلم برادران وطن کے زعماء کو باہم منصفانہ معاہدہ کرنے کی ترغیب دلائی ہے حضرت شاہ صاحبؒ رقم طراز ہیں:

''ایسے معاہدہ کا موضوع صرف یہ ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کا پورا پورا احترام کرے

اور ایک دوسرے کے جان ومال، عزت وآبرو پر حملہ آور نہ ہو، ایذا دہی کو حرام سمجھے اور اپنے مذہب پر عمل کرنے کے لئے آزاد ہو، دوسرے مذہب پر دل آزار حملے نہ کرے، مسلمان احکام اسلام، اور حدود شریعت بیضا کے اندر ایسے معاہدے کا سب سے پہلے خیر مقدم کریں گے بلکہ اپنے مذہبی احکام کے بہ موجب وہ اپنی معاہد (عہد کرنے والی) قوم کی جان ومال کے بھی محافظ بن جائیں گے۔

دنیا کی تاریخ میں اس کی ہزاروں مثالیں موجود ہیں کہ مسلمانوں نے اپنے قوت وشوکت کے زمانے میں اپنی معاہد غیر مسلم قوم کی جان ومال کی حفاظت کی ہے اور اپنی جانیں دے دی ہیں..........۔

......چوں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ دوسری قومیں بھی آباد ہیں اور ہندوستان ان کا بھی وطن ہے، ان کو بھی طبعی طور پر ہندوستان کے ساتھ محبت ہونی چاہیے، اس لیے تمام ہندوستانیوں کے قلوب میں ہندوستان کی آزادی کی خواہش ایک ہی مرتبہ اور ایک ہی درجہ پر لازم ہے، مگر چوں کہ ہندوستان کی قوموں میں کثرت تعداد ہندو قوم کو حاصل ہے اور اس کے اعتبار سے مسلمان اقلیت میں ہیں، اس لیے ان کے قلوب میں اپنے مذہبی حقوق اور وطنی مفاد کی حفاظت کا خیال لازمی طور پر پیدا ہونا چاہیے اور ان کے نزدیک اس کی بہترین صورت یہی ہے کہ دونوں قومیں ایک منصفانہ معاہدہ کرلیں تاکہ کسی کے دل میں کوئی خطرہ باقی نہ رہے کہ آزادی کے زمانے میں کثیر التعداد قوم، قلیل التعداد کو نقصان پہنچا سکے، اگر منصفانہ معاہدہ کے ذریعہ سے مسلمان کو مطمئن کردیا جائے تو پھر ان کے لیے کوئی وجہ تشویش باقی نہیں رہتی''۔ (خطبۂ صدارت، ص ۳۱، ۳۲-۳۴)

جنگ آزادی کے مجاہد عظیم اور تحریک خلافت کے روح رواں مولانا محمد علی جوہر نے تحریک خلافت کے پلیٹ فارم سے حصول آزادی کے لیے اہل وطن میں جذبۂ حب الوطنی کے بیدار کرنے میں نمایاں رول ادا کیا تھا، اس لیے ان کے نزدیک استخلاص وطن کے لیے ہندو مسلم اشتراک کار کے ناجائز ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، قاضی محمد عدیل عباسی رقم طراز ہیں:

''تحریک خلافت نے مسلمانوں میں ایک عظیم وطنی جذبہ پیدا کیا، ان کو محسوس ہوا کہ وہ

ایک بڑی طاقت ہیں اور اگر وہ اس طاقت کو استعمال کریں تو برطانیہ کو جڑ سے اکھاڑ پھینک سکتے ہیں، مگر اسی کے ساتھ ان کو یہ بھی محسوس ہوا کہ اس طاقت کے استعمال کے لیے ملک کی تمام جماعتوں سے اتحاد و اتفاق لازمی ہے، ہجرت کی تحریک جس طرح ناکام ہوئی، اس نے بھی مسلمانانِ ہند میں اپنے ملک اور وطن سے محبت کے احساس کو تیز کردیا۔

جو نظارہ ہندو مسلم اتحاد کا خلافت تحریک کے زمانہ میں آنکھوں کے سامنے آیا اس کو پھر دیکھنے کے لیے آنکھیں ترس گئیں، تحریک آزادی نے عوام کے دل و دماغ پر قبضہ کرلیا تھا، اب صرف ایک جذبہ کارفرما تھا کہ انگریز کو ہندوستان سے نکال باہر کیا جائے اور اس کے لیے سارا ہندوستان پھٹے کپڑوں، ننگے سر اور ننگے پیر والے رضا کاروں سے بھر گیا، لوگ اپنا کام کاج چھوڑ کر نکل آئے اور صرف تین نعرے ہندو مسلمان مل کر نکالتے تھے، "اللہ اکبر، مہاتما گاندھی کی جے، مولانا محمد علی کی جے"، کالجوں اور اسکولوں سے ہندو اور مسلمان لڑکے نکل پڑے اور دوش بہ دوش کام شروع کردیا، ایک لہر تھی جو موجِ دریا کی طرح رواں دواں تھی، کہیں اختلاف یا نفرت کا ایک دوسرے سے نام و نشان نہ تھا۔

تحریک خلافت نے ہندوستان کے اندر ایک عام جذبہ، منزلِ آزادیِ کامل کی جانب عزم و ہمت سے چلنے کا اور راہ کی مشکلات و مصائب پر استقامت بالحق اور تمنائے سرفروشی سے کام کرنے کا عملی سبق دیا"۔ (تحریک خلافت، ص ۲۷۱-۲۷۲)

اب آیئے یہ دیکھا جائے کہ آزادیِ وطن کے لیے ہندو مسلم اتحاد کے سلسلے میں جنگ آزادی کے مردِ جلیل مولانا ابوالکلام آزاد کا نقطۂ نظر کیا تھا؟ مولانا آزاد نے مجلس خلافت کے اجلاس منعقدہ ۲۵ر اگست ۱۹۲۱ء (بہ مقام آگرہ) میں استخلاصِ وطن کے لیے ہندو مسلم اتحاد پر اظہار خیال کرتے ہوئے علی رؤس الاشہاد فرمایا تھا:

"ہندوستان کی نجات کے لیے، ہندوستان میں مسلمانوں کے بہترین فرائض انجام دینے کے لیے ہندو مسلم اتحاد ضروری ہے، یہ میرا عقیدہ ہے، جس کا اعلان میں ۱۹۱۲ء میں الہلال کے پہلے نمبر میں کرچکا ہوں، میں امید رکھتا ہوں کہ ایسے لوگ موجود ہوں گے جنہوں نے الہلال کو فراموش نہ کیا ہوگا، الہلال کے پہلے نمبر میں جس بڑے نمایاں مقصد کا اعلان کیا گیا تھا، کیا تھا؟

میں فخر کے ساتھ اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ہندو مسلمانوں کا اتفاق تھا، میں نے مسلمانوں کو دعوت دی تھی کہ احکام شرع کی رو سے مسلمانوں کے لیے اگر کوئی فریق ہوسکتا ہے جو نہ صرف ایشیا کو، مشرق کو بلکہ اس تمام کرۂ ارضی کی سچائی کو آج چیلنج دے رہا ہے، اس کو مٹا رہا ہے، جس کے غرور سے اللہ کی عالم گیر صداقت کو سب سے بڑا خطرہ ہے، وہ برٹش گورنمنٹ کے سوا کوئی دوسری طاقت نہیں ہے، اس لیے ہندوستان کے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ احکام شرع کو سامنے رکھ کر حضور پیغمبر اسلام ﷺ کے اس اسوۂ حسنہ کو پیش نظر رکھ کر جو انہوں نے اہل مدینہ اور بت پرست لوگوں سے مصالحت کرتے ہوئے دکھایا، وہ نمونہ جو خود سرور کائنات نے عملاً پیش کیا ہے اور عملاً و حکماً جو تعلیم قرآن نے دی ہے، ہندوستان کے مسلمانوں کا یہ فرض شرعی کہ وہ ہندوستان کے ہندوؤں سے کامل سچائی کے ساتھ عہد و محبت کا پیمان باندھ لیں اور ان کے ساتھ مل کر ایک نیشن ہوجائیں، میرے الفاظ یہ تھے کہ ہندوستان کے سات کروڑ مسلمان، ہندوستان کے بائیس کروڑ ہندو بھائیوں کے ساتھ مل کر ایسے ہوجائیں کہ دونوں مل کر ہندوستان کی ایک قوم اور نیشن بن جائیں، اب میں مسلمان بھائیوں کو سنانا چاہتا ہوں کہ خدا کی آواز کے بعد سب سے بڑی آواز جو ہوسکتی ہے وہ محمد (ﷺ) کی آواز تھی، اس وجود مقدس نے عہد نامہ لکھا بجنسہ یہ اس کے الفاظ ہیں "انهم امة واحدة" "ہم ان تمام قبیلوں سے جو مدینہ کے اطراف میں بسے ہیں صلح کرتے ہیں، اتفاق کرتے ہیں اور ہم سب مل کر ایک "امت واحدہ" بننا چاہتے ہیں، امت کے معنی ہیں قوم اور نیشن اور واحدہ کے معنی ہیں ایک۔

اگر میں نے اپنی اپیل میں یہ کہہ دیا کہ ہندوستان کے مسلمان اپنا بہترین فرض اس وقت انجام دیں گے جب وہ ہندوؤں کے ساتھ ایک ہوجائیں گے تو یہی وہ لفظ ہے جو اللہ کے رسول ﷺ نے بھی اس وقت لکھوا دیا تھا کہ ہم سب مل کر قریش کے مقابلے میں ایک نیشن ہوجائیں گے، جن مقاصد کی بنا پر سرور کائنات ﷺ نے یہ عہد کیا تھا، اس سے زیادہ وجوہ آج آپ کے لیے موجود ہیں، اگر اس وقت صرف قریش مکہ کی ایک جماعت تھی جو اسلام کو غربت میں دھمکی دے رہی تھی تو آج اس غربت ثانیہ میں صرف مٹھی بھر قریش نہیں بلکہ کرۂ ارضی کی دو تہائی بسنے والی قومیں، اسلام کو مٹانا چاہتی ہیں، اگر رسولِ خدا ﷺ مٹھی بھر قریش مکہ کے مقابلے میں، ابوسفیان

کے مقابلے میں، اطراف مدینہ کے تمام قبائل سے اتفاق کر سکتے ہیں تو آج اس عظیم الشان قوت
کے غرور، گھمنڈ، خوں خواری کے مقابلے میں جو تمام مشرق کی آزادی کو پامال کرنا چاہتی ہے، کیا
ہندوستان کے مسلمانوں کا یہ فرض نہیں ہے کہ وہ اپنے بائیس کرور ہندوؤں کے ساتھ مل کر ایک
ہوجائیں"۔ (خطبات آزاد، ص ۵۰، ۵۱، ۵۲)

مارچ ۱۹۴۰ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس رام گڑھ میں مولانا آزاد نے اپنے
تصور قومیت کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا تھا:

"بہ حیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دایرے میں ایک خاص ہستی رکھتا
ہوں اور میں برداشت نہیں کرسکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے لیکن ان تمام احساسات کے
ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں، جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے، اسلام کی
روح مجھے اس سے نہیں روکتی، وہ اس راہ میں میری رہ نمائی کرتی ہے، میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا
چوں کہ میں ہندوستانی ہوں، میں ہندوستان کی ایک ناقابل تقسیم "متحدہ قومیت" کا ایک عنصر ہوں،
میں اس متحدہ میت کا ایسا اہم عنصر ہوں، جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے،
میں اس کی تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل (Factor) ہوں، میں اپنے اس دعوے سے کبھی
دست بردار نہیں ہوسکتا"۔ (خطبات آزاد، ص ۲۹۷-۲۹۸)

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی تصنیف "متحدہ قومیت اور اسلام" کا بالاستیعاب
مطالعہ کر کے دیکھا جائے کہ آزادی وطن کے سلسلے میں علامہ شبلیؒ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ،
علامہ سید سلیمان ندویؒ، مولانا محمد علی جوہرؒ اور مولانا ابوالکلام آزادؒ کے خیالات وافکار جو سطور بالا
میں پیش کیے گئے ہیں، ان سے ہٹ کر مولانا حسین احمد مدنیؒ نے وہ کون سا جدید نظریہ پیش کر دیا
ہے جو قرآن وسنت سے متصادم ہے، جس کی بنا پر مولانا مدنی پر جنگ آزادی کے دوران بھی وطن پرستی
کا الزام عاید کیا گیا اور آزادی کے بعد جب کہ نصف صدی سے زائد عرصہ گزر چکا ہے، مولانا مدنیؒ
پر طنز وتعریض کا سلسلہ جاری ہے:

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا؟

آخر میں پروفیسر عبدالمغنی کے مقالہ "مولانا آزاد کا تصور قومیت" سے ایک اقتباس

پیش کیا جارہا ہے جو غیر جانب دارانہ بھی ہے اور منصفانہ بھی!

"......نصف صدی قبل نیشن کے تصور پر جو بحث ونزاع ہوئی اس میں توجہ اس
انگریزی لفظ کے اردو ترجمے پر نہیں، اس کے سیاسی مفہوم پر مرکوز رہی، اس سلسلے میں علامہ اقبال
اور مولانا حسین احمد مدنی کے درمیان جو مباحثہ ہوا، اس کو سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ
مولانا کے پیش نظر عربی زبان میں لفظ "قوم" کا قدیمی استعمال تھا، جب کہ اقبال کے مدنظر
لفظ "نیشن" کے سیاسی مضمرات تھے، اس موضوع پر مولانا ابوالاعلا مودودی نے اپنی تصنیف
"مسئلۂ قومیت" میں مفصل بحث کی ہے، یہ تینوں حضرات معروف ومسلم علما وفضلا ہیں اور ان
میں کسی کا مطمح نظر خدا پرستی کے مقابلے میں زمین پرستی نہیں ہے، نیشن کے ساتھ "ازم" جوڑ کر
اردو میں اس کا ترجمہ "یت" کے ساتھ کیا جائے یا "پرستی" کے ساتھ مقصد کسی کا بھی پرستش نہیں
صرف الفت اور وابستگی ہے"۔ (ایوان اردو، دہلی، مولانا ابوالکلام آزاد نمبر، ص ۱۱۹)۔

اخبار علمیہ

کئی برس سے برمنگھم سے جمعیۃ اہل حدیث کا ایک ماہانہ رسالہ ''صراط مستقیم'' شائع ہورہا ہے، حال ہی میں اس کے ایک اداریے میں جامعہ ازہر کے حوالے سے یہ تحریر کیا گیا ہے کہ اس وقت دس ہزار سے زیادہ ایسی ویب سائٹ انٹرنیٹ پر مہیا ہیں جو اسلام اور اس کی آفاقی تعلیمات کو ازکار رفتہ اور مسلمانوں کو دہشت گرد اور غیر مہذب ثابت کرنے میں سرگرم عمل ہیں جب کہ ان سائٹوں کے مقابلے کے لیے مسلمانوں کی صرف دوسو ہی سائٹیں ہیں جن پر سالانہ ایک ملین ڈالر صرف ہوتا ہے، اسلام مخالف سائٹوں کو چلانے میں سالانہ ایک بلین اخراجات کا اندازہ کیا گیا ہے، ان میں بعض میں رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس کو ہدف تنقید بنایا گیا ہے، بعض میں عربی عبارتوں پر مشتمل قرآنی آیتوں کی نقل اتاری گئی ہے، بعض میں قرآنی آیتوں کو خنزیر، کتے یا دوسرے مکروہ جانوروں کی صورت عطا کی گئی ہے ''القرآن'' اور'' سورۃ من مثلہ'' نامی سائٹوں میں قرآنی سورتوں جیسی سورہ بنانے کی ناکام کوشش بھی کی گئی ہے، ایک سائٹ کا نام نسلی امتیاز ہے، جس میں اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کو متعصب، نسل پرست دکھایا گیا ہے، ''برہنہ یا عریاں'' نام کی ایک سائٹ میں عریاں اور اوباش عورتوں کو قرآنی آیتیں ہاتھ میں لیتے ہوئے دکھایا گیا اور ان کے جسموں پر قرآنی آیتیں بھی کندہ ہیں، ظاہر ہے ان شیطانی سائٹوں کو اسلام کے ازلی دشمن یہودیوں کی پشت پناہی حاصل ہے، رپورٹ کے مطابق بعض یہودی تنظیموں نے ۱۹۸۰ء میں پہلی بار کمپیوٹر کے ذریعہ اسلام کو بدنام کرنے کی کوشش کی تھی۔

مکہ کی مسلم ورلڈ لیگ کی جانب سے منعقدہ کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے شاہ عبداللہ نے کہا کہ ہمیں اپنے مذہب کو صحیح پس منظر میں پیش کرنے کی ضرورت ہے، ان کے نزدیک امت مسلمہ کو درپیش گوناگوں چیلنج میں ایک زبردست چیلنج جس کا تعلق خاص طور سے مسلمانوں کے مستقبل سے ہے، وہ ان کے مروجہ قدیم نصاب وطرز تعلیم کا مسئلہ ہے، ان کا کہنا ہے کہ غلط تعلیم امت پر منفی اثرات ہی نہیں ڈالے گی بلکہ مسلمانوں کو ایک درخشاں تہذیبی لیگ سے منحرف

کر کے ان کو اجنبی شاہ راہوں پر لا کھڑا کر دے گی، اس لیے ہماری کوششیں اور اقدامات ایسے حقائق پر مرکوز ہونے چاہئیں جن کی بنیادیں شریعت کے اصولوں پر قائم ہوں، مسلم ورلڈ لیگ کے سکریٹری نے کہا کہ ہمارے ادارے نے تعلیمی پالیسی اور منصوبے پر کام کرنے کے لیے انٹرنیشنل کمیشن مقرر کیا ہے جو عصر حاضر کے ذہن اور تقاضے کو ملحوظ رکھ کر مذہب اسلام کی درس و تعلیم کا نصاب تیار کرے گا، انہوں نے اس سلسلے میں مباحثہ کے لیے انٹرنیشنل فورم بھی منعقد کرنے کا اعلان کیا ہے، جس میں یورپین ممالک کے نمائندے بھی شریک ہوں گے۔

تھائی لینڈ میں چودہ فیصد مسلمان ہیں، وہاں سات سے پندرہ برس تک کے بچوں کے لیے تعلیم قانوناً لازمی ہے، یہی وجہ ہے کہ یہاں کی ملکی شرح خواندگی ۹۳% ہے، مسلمانوں کے دوسو پرائیوٹ مدرسے ہیں جو زیادہ تر جنوب میں ہیں، مسلمانوں کے جن اسکولوں میں قومی نصاب تعلیم داخل ہے ان کو وہاں کی صوبائی حکومتیں فنڈ بھی مہیا کرتی ہیں، سرکاری مدارس میں بھی اسلام کی بنیادی تعلیمات تھائی زبان میں دینے کا انتظام ہے، ادہر حالیہ چند برسوں میں مسلمان جنوبی تھائی لینڈ کے صوبائی اسکولوں میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں، اس کے علاوہ سینئر یونی ورسٹیوں میں لکچرر کی حیثیت سے بھی ان کا تقرر ہونا شروع ہو گیا ہے، پرنس آف ساکلا یونی ورسٹی کے تحت اسلامک کالج بھی اسٹیبلش کیا گیا ہے جو تھائی لینڈ میں مطالعات اسلام کا سب سے بڑا ادارہ بھی ہے، ینگ مسلم ایسوسی ایشن آف تھائی لینڈ اور اسلامک سنٹر آف تھائی لینڈ فاؤنڈیشن کے نام سے مسلمانوں کی دو رفاہی تنظیمیں بھی مصروف کار ہیں۔

جاپانی اخبار ''مینچی شمبن'' میں پالتو پرندوں سے متعلق ایک رپورٹ شائع ہوئی ہے کہ ان میں بھی انسانوں کی طرح زبانوں میں فرق کرنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے، جاپانی سائنس دانوں کے مطابق بندر اور چوہوں سمیت متعدد دودھ پینے والے جانوروں کی آواز شناسی کی اہلیت کا پردہ پہلے ہی فاش ہو چکا ہے، اب پالتو پرندوں میں بھی زبانوں کے درمیان فرق کرنے کی قوت پہلی بار سامنے آئی ہے، جاپانی محققین کے مطابق انہوں نے انگریزی اور جاپانی تحریروں کے کچھ حصے ان پرندوں کو سنائے اور فوراً ہی ان کی آواز سنی گئی تو انہوں نے انگریزی اور جاپانی زبان کے فرق کو واضح طور پر نمایاں کیا، ان کے بقول زبانوں سے واقفیت کے بغیر ان میں فرق کرنے کی صلاحیت

صرف انسانوں میں ہوتی ہے، پرندوں میں یہ صلاحیت پہلی بار سامنے آئی ہے۔

ہزاروں برس قبل مکہ میں وجود میں آنے والا آب زم زم کا کنواں فقید المثال ہے، عمرہ و حج کرنے والے لاکھوں زائرین ہر سال اس سے سیراب ہوکر خود کو تازہ دم کرتے ہیں، متعدد تحقیقات سے ثابت ہو چکا ہے کہ روئے زمین پر اس سے زیادہ صحت افزا اور عمدہ ترین پانی موجود نہیں ہے، حالیہ سائنسی تجزیہ کے مطابق کیلشیم، فلورائڈ اور میگنیشیم کی اعلا مقدار اس پانی میں پائی جاتی ہے جو اسے پینے والے کو صحت مند و توانا بناتا ہے، جدید مطالعہ سے صدیوں قبل اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ اس میں غذائیت اور امراض سے نجات دینے کی پوری صلاحیت موجود ہے، یہ کنواں خانہ کعبہ سے چند میٹر کے فاصلہ پر ۳۰ میٹر گہرا ہے۔

امریکہ کے صوبہ بوسٹن میں واقع میسیچویسٹ انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی کے سائنس دانوں نے ایسی ٹکنک ایجاد کی ہے جس کی مدد سے بنائے جانے والے شیشوں پر اب کہرے اور دھند کا اثر نہیں پڑے گا، ان کا دعوا ہے کہ اس شیشے کو گاڑی میں استعمال کرنے سے ڈرائیور کو کہرے میں بھی صاف نظر آئے گا، انہوں نے اپنی ٹکنک کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ انہوں نے ایک ایسے نینو پارٹکل کوٹنگ کو ترقی دی ہے جو شیشے پر لگانے کے بعد روشنی کو صرف ۵.۲ فیصد ہی جذب کرے گا، یہ موسم کی تحقیق میں استعمال ہونے والے شیشے کے بالمقابل ۲ سے ۳ فیصد کم روشنی جذب کرے گا جس کے سبب اس میں کہرا اور دھبہ کو جذب کرنے کی صلاحیت معدوم ہو جائے گی اور بالکل صاف دکھائی دے گا۔

سبتہ اور ملیلہ اسپین کے زیر انتظام دو شہر ہیں، سبتہ میں ۲۹ ر اور ملیلہ میں ۲۷ ر ہزار مسلمان آباد ہیں، اب تک اسپین کے ان ہی دو شہروں میں اسلامیات کی تعلیم و تدریس کا انتظام تھا، مگر اب مسلمانوں کی نمایندہ تنظیم اسلامی کمیٹی کی کوششوں سے اسپین کی حکومت نے اپنے تمام سرکاری کالجوں میں اسلامیات کی تعلیم و تدریس شروع کرنے کا اعلان کیا ہے، قرآن مجید کے علاوہ دیگر مضامین جیسے اخلاق، سیرت، مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلقات کی نوعیت، نسائیات اور دوسری تہذیبوں کے تقابل وغیرہ موضوعات بھی اسپینی زبان میں پڑھائے جائیں گے، عدلیہ کے وزیر عدل کے بیان کے مطابق جیلوں میں بھی اسلامیات کی تعلیم کو رواج دیا جائے گا۔

ک۔ص۔ اصلاحی

وفیات

شیر مردوں سے ہوا بیشۂ تحقیق تہی

(رشید حسن خاں کی یاد میں)

از:- ڈاکٹر شمس بدایونی☆

۲۶ ر فروری بروز اتوار صبح کے سات بجے تھے، میں سفر کے لیے تیار ہو کر پورٹیکو کے قریب پہنچ چکا تھا، معاً فون کی گھنٹی بجی، میں واپس ہوا، ریسیور اٹھایا اُدھر سے آواز آئی ”میں حنیف نقوی۔ رشید حسن خاں صاحب کا رات انتقال ہوگیا آپ ان کی تدفین میں شریک ہوسکتے ہیں“۔ میں کسی اہم وجہ سے اپنے سفر کو ملتوی نہیں کرسکا اور تدفین میں شرکت سے معذور رہا، مگر اس دن ایک اضمحلال کی کیفیت طاری رہی، ان سے ملاقاتیں اور فون پر کی گئی باتیں یاد آتی رہیں، ان کی اعتماد و یقین سے بھرپور آواز۔ کاٹ دار جملے، بے تکلف لہجہ، کچھ خاص تکیہ کلام، ہاں بھائی، ارے بھئی، دیکھیے، یہ جو ہیں نا، ہاں بس ان کے لہجے اور بیان کا طنطنہ سماعت پر بار بار دستک دیتا رہا، میں کبھی محظوظ ہوتا رہا اور کبھی ملول، اب یہ آواز سننے کو کہاں ملے گی؟ کون اس طرح دوٹوک انداز میں پکارے گا؟

۱۔ ”ہیلو۔ ارے بھئی! آپ کہاں ہیں؟ ایک ماہ ہوگیا آپ کا کوئی فون نہیں آیا۔ دیکھیے شمس صاحب! کم از کم مہینے میں ایک بار ضرور فون کیجیے۔ یا پھر تعلق منقطع کرلیجیے“۔

۲۔ ”ہیلو، جی میں شمس بول رہا ہوں۔ ہاں بھئی شمس صاحب کیسے ہیں آپ؟ آپ کے بچے کیسے ہیں؟ کیسی ہے ہماری بہو؟ اور ہمارے لطیف صاحب ٹھیک ہیں! کاروبار کیسا چل رہا ہے آپ کا؟ کیا لکھ رہے ہیں آج کل آپ؟

دیکھیے شمس صاحب میں برابر سن اور پڑھ رہا ہوں کہ آپ لگاتار سیمناروں میں شرکت کررہے ہیں، یہ ٹھیک نہیں ہے، آپ کو جم کر سنجیدگی کے ساتھ کسی موضوع پر تین چار سال کام کرنا چاہیے، بس اگر آپ یہ نہیں کریں گے تو خود کو ضائع کردیں گے، ارے بھائی، میں یہ سب اس لیے

☆۵۸، نیو آزاد پورم کالونی، چھاؤنی اشرف خان، پوسٹ عزت نگر، بریلی ۲۴۳۱۲۲۔

کہہ رہا ہوں کہ میں آپ سے کچھ بہتر توقعات رکھتا ہوں، باقی '' آپ کی مرضی ''۔

۳- '' ہاں شمس صاحب، وہ جو فلاں صاحب ہیں نا، وہ تو فرقہ ملامتیہ سے متعلق معلوم ہوتے ہیں، ان کی تحریروں میں معائب کے کیڑے بری طرح بلبلا رہے ہیں اور آپ لکھتے ہیں کہ وہ عالم و فاضل ہیں، بھائی یہ سب کیا ہے؟ کیا آپ بھی اوروں کی طرح دنیا ساز بن گئے؟ دیکھیے شمس صاحب ایک بات سمجھ لیجیے، تحقیق شرک کو گوارا نہیں کرتی، آپ اگر کسی کو ناراض نہیں کر سکتے تو قلم رکھ دیجیے - دنیا میں بہت سے کام کیے جا سکتے ہیں کیا ضروری ہے کہ آپ تحقیق ہی کریں''۔

۴- ہیلو- کہیے شمس صاحب کیسے ہیں آپ؟ جی، میں ایک مضمون نواب محمد یار خاں امیر پر لکھنا چاہتا ہوں، مواد اکٹھا کر لیا ہے، رکیے شمس صاحب، کیا آپ نے ناظم رام پوری کا یہ شعر سنا ہے:

غلطی غیر کی گفتار کی دیکھی ناظم　　جب میں جاتا ہوں تو کہتا ہے نواب آتے ہیں

سمجھ گئے نا؟ - جی میں سمجھ گیا صحیح تلفظ نوّاب ہے - ہاں اب بتایئے، کیا امیر کے حالات وکلام یکجا کرنا ٹھیک ہوگا؟...... سنیے شمس صاحب، امیر ادب میں صرف اپنے ایک شعر:

شکست و فتح میاں اتفاق ہے لیکن　　مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا

کی وجہ سے مشہور ہیں اور مشہور رہیں گے بس، اس سے زیادہ ان کی اہمیت نہیں، آپ ان پر اتنی محنت کیوں کرتے ہیں؟ دیکھیے موضوع کی ترجیح کو ذہن میں ضرور رکھا کیجیے، قاضی عبدالودود نے رضا عظیم آبادی پر تحقیق کی، بلا شبہ اعلا درجہ کا کام کیا، رضا بے چارے کو کیا ملا؟ وہ آج بھی غیر معروف اور غیر اہم شاعر ہے، آپ کو ابھی بہت کچھ کرنا ہے اپنا وقت ایسے ویسے کاموں میں برباد نہ کیجیے، صرف ڈھنگ کے کام کیجیے، جیسے آپ پہلے بھی کر چکے ہیں۔

دن بھر میں ان کی آواز کی قید میں رہا، وہ مجھے مخاطب کرتے رہے اور میں ایک نیاز مند کی طرح سنتا رہا، رات کو جب گھر واپس لوٹا تو گیارہ بجے شب ان کے بیٹے خورشید حسن خاں کو میں نے فون کیا، تب معلوم ہوا کہ ۲۵ر اور ۲۶ر فروری کی درمیانی شب دو بج کر چالیس منٹ پر ان کو دل کا دورہ پڑا اور روح پرواز کر گئی، ۲۶ر فروری کی شام پانچ بجے باڑوزئی پشاوری قبرستان میں ان کی تدفین ہوئی۔

یہ یاد نہیں کہ رشید صاحب سے میرے تعلق کی ابتدا کب ہوئی تاہم اتنا ضرور یاد ہے کہ

۱۹۸۸ء میں جب میری کتاب '' اردو نعت کا شرعی محاسبہ '' شائع ہوئی تو اس پر انہوں نے غالب نامہ دہلی (جنوری ۱۹۸۹ء) میں تبصرہ لکھا تھا، اس وقت تک میرے اور ان کے بیچ شناسائی کا رشتہ قائم نہیں ہوا تھا، یہ میری خوش نصیبی تھی کہ انہوں نے میری طلب و خواہش کے بغیر محض موضوع کے بدیع و نادر ہونے کے سبب تبصرہ لکھا اور خوب لکھا۔

۱۹۹۵ء میں جب میرا علمی مقالہ '' نظامی بدایونی اور نظامی پریس کی ادبی خدمات '' چھپ کر منظر عام پر آیا تو اس کی ایک کاپی خاں صاحب کو بھی ارسال کی گئی، خاں صاحب نے ۹ر جون کو مجھے ایک طویل خط لکھ کر مقالے کی خوب داد دی، میرے دل میں خاں صاحب کے علم و فضل، احتساب و سخت گیری کا جو رعب و دبدبہ تھا اس خط کو پڑھ کر وہ احساس ان سے نیاز مندی اور ان کی محبت میں تبدیل ہو گیا، اس وقت وہ دہلی میں تھے، اسی خط میں انہوں نے یہ اطلاع بھی دی تھی کہ آج کل وہ مثنویات شوق مرتب کر رہے ہیں اور اس سلسلے میں انہیں مثنوی '' زہر عشق '' کے نسخہ نظامی (بدایوں) کی تلاش تھی، جس کا طبع ثانی شمس الرحمن فاروقی سے مل گیا لیکن طبع اول ۱۹۱۹ء نہیں مل سکا، اسی خط میں انہوں نے لکھا کہ:

'' آپ کے نظامی صاحب نے مجھے بہت پریشان کر رکھا ہے، آج کل زہر عشق کا نسخہ نظامی میرے پاس نہیں تھا، بارے شمس الرحمن فاروقی صاحب نے بھیج دیا اور ایک نسخہ بدایوں سے آ گیا، اس میں مرحوم نے تنسیخ ممانعت کے آرڈر کا نمبر بھی لکھا ہے مگر حسب معمول ادھوری بات لکھی ہے اور انداز بیان بڑا مبہم ہے، کچھ بھی واضح نہیں ہوتا، میں نے الہ آباد آرکائیوز میں اس نمبر کے آرڈر کو نکلوانا چاہا، معلوم ہوا کہ وہاں ۱۸۵۷ء تک کے کاغذات ہیں، بعد کے کاغذ لکھنؤ میں ہیں، اب لکھنؤ آرکائیوز کے لیے وہ حضرات کو لکھا ہے، دیکھیے کیا رہتا ہے، مرحوم اگر ذرا سی وضاحت کر دیتے تو اس قدر پریشانی نہ ہوتی، قطعہ تاریخ کا بھی احوال یہی ہے، شوق کی عمر اس وقت ۷۷ برس کی تھی اور ذاکر ۲۷ برس کے تھے، اس کو معاصرت اور مصاحبت کیسے کہیں گے؟ پھر حوالہ حسب معمول ادھورا بلکہ مجہول، اب اس کی تصدیق کے لیے سرگرداں ہوں، ہاں آپ یہ پتا لگا سکتے ہیں کہ ذاکر مرحوم لکھنؤ میں کس زمانے میں تھے اور کیا کرتے تھے؟ ہے کوئی صورت''۔ (خط مکتوبہ ۹ر جون ۱۹۹۵ء)

اسی سلسلے کی بعض باتیں اور بھی تھیں جو بعد کے کئی خطوط میں زیر بحث آئیں، مثلاً ایک

خط میں انہوں نے مجھے لکھا:

"کتاب میں ص ۳۴۱/۷ پر ذاکر بدایونی کا قطعہ تاریخ مشمولہ زہر عشق درج کیا گیا ہے، اس میں تین باتیں ایسی ہیں جن سے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں، ۱- آخری مصرعے کے آخر میں "کذا" ہے، یہ کیوں آیا ہے؟ اس کا تعلق پورے مصرعے سے ہے یا کسی خاص لفظ سے؟ ۲- "آیی" لکھا گیا ہے، مگر اصل نسخے (زہر عشق طبع ۱۹۲۰ء) میں "آئی" ہے، اسے کیوں بدلا گیا، جب کہ بہ قول اساتذۂ فن تاریخ "آئی" کے ۲۱ عدد ہوتے ہیں اور وہی یہاں مراد لیے گئے ہیں، ۳- چوتھے مصرعے میں "رہنمائی" ہے مگر اصل نسخے میں اس کی جگہ "رونمائی" ہے، اسے کیوں بدلا گیا؟

میں نے ازراہ احتیاط (نہ کہ ازراہ اعتراض) یہ باتیں پوچھی ہیں کہ شاید طبع اول (۱۹۱۹ء) میں اسی طرح ہو، وہ اشاعت یعنی طبع اول مجھے نہیں ملی، دوسری اشاعت (۱۹۲۰ء) میرے سامنے ہے"۔ (خط مکتوبہ ۷/ فروری ۱۹۹۶ء)

خطوط کے مذکورہ اقتباسات سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ متن کے اجزا کو کتنی باریک بینی سے دیکھا کرتے تھے اور ان کے تحریری اختلافات کو آخری حد تک حل کرنے اور سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔

رشید حسن خاں جن دنوں مثنویات شوق مدون کر رہے تھے، انہوں نے اس کے طویل مقدمے کے بعض حصے مختلف مضامین کی صورت میں ہم عصر رسائل میں شائع کرائے، جولائی ۱۹۹۶ء کے آج کل (دہلی) میں ان کا ایک مضمون "مثنویات شوق منبع اشاعت" شائع ہوا، جس میں انہوں نے مثنویات یا ان میں سے کسی ایک مثنوی کی اشاعت پر حکومت کے ذریعے لگائی گئی پابندی کی روایت کو بعض دلائل کی بنیاد پر قطعی طور پر رد کر دیا اور نظامی بدایونی (ف ۱۹۴۷ء) کے تنسیخ ممانعت اشاعت کے آرڈر اور اس کے نمبر و تاریخ کے اندراج کو بھی فرضی قرار دیا، اس مضمون پر کاظم علی خاں (لکھنؤ) اور بعض دوسرے اہل قلم نے آج کل میں خطوط لکھ کر خاں صاحب کے نتائج و خیال کی تردید کی، راقم الحروف نے اس سلسلے میں خاں صاحب کو خط لکھا، جس کے جواب میں انہوں نے لکھا:

"نظامی کا آرڈر نمبر ہو یا مولانا حالی، سید ضامن علی اور ایسے ہی دوسرے بزرگوں کی

روایتیں جب تک ان کا قابل قبول ثبوت نہ ملے، یہ قابل استدلال نہیں ہو سکتیں، ہمارے بزرگ بہت زود یقین اور خوش گمان تھے، اس لیے ہمیں ان کی تحریروں سے استفادہ ضرور کرنا چاہیے مگر آداب تحقیق کے تحت، آپ کے انداز نگارش سے مجھے یہ محسوس ہوا کہ مولانا نظامی ہیرو بن گئے ہیں، دیکھیے ہیرو ورشپ درست انداز فکر نہیں، نسخۂ نظامی میں پانچ شعر الحاقی ہیں تو کیا انہیں مان لیا جائے گا؟ اس طرح مت سوچا کیجیے، ایوان اردو کے حالیہ شمارے میں جو تحریریں شائع ہوئی ہیں اس میں الحاقی اشعار کا کچھ بیان آ گیا ہے، مجھے قاضی عبدالودود صاحب کا یہ قول ہمیشہ یاد رہتا ہے کہ مردوں کا حق ہم پر زندوں سے زیادہ نہیں، راوی مرحوم ہو یا زندہ ایک ہی طریق کار اختیار کیا جائے گا، قبول روایت میں"۔ (خط مکتوبہ ۱۳/ جولائی ۱۹۹۶ء)

اسی سلسلے کا ایک مضمون ایوان اردو دہلی (اپریل ۱۹۹۸ء) میں بہ عنوان "مثنویات شوق- لکھنوی معاشرت کے آئینے میں" شائع ہوا تھا جو بڑا ہنگامہ پرور ثابت ہوا، اس مضمون میں خاں صاحب نے شرر کی گذشتہ لکھنؤ اور حکیم نجم الغنی خاں کی تاریخ اودھ کے حوالے سے لکھنؤ کی عیش و نشاط کی زندگی کا ایک خاص انداز میں تذکرہ کیا تھا اور اس معاشرے میں طوائف کے کردار کو جزو زندگی دکھایا تھا، معاشرے کے سواد اعظم پر ارباب نشاط کے تسلط کو شوق کے اشعار کا پس منظر قرار دیتے ہوئے شوق کی مثنویات کو لکھنوی معاشرت کا آئینہ دار بتایا تھا، بعض حلقوں نے اس مضمون کو اہالیان لکھنؤ کی تذلیل سمجھا، چنانچہ پروفیسر نیر مسعود نے اس کا جواب ایک مراسلے نما مضمون کی صورت میں دیا جو "بہ نام رشید حسن خاں" کے عنوان سے ایوان اردو (دہلی) کی جولائی ۱۹۹۸ء کی اشاعت میں شامل ہوا، یہ بڑا سخت جواب تھا جس میں رسمی آداب و اخلاق کو بھی بالائے طاق رکھ دیا گیا تھا، میں اس مضمون کو پڑھ کر لرز گیا اور کئی مرتبہ میرے لبوں پر یہ مصرعہ آ گیا:

مشکل بڑی پڑے گی برابر کی چوٹ ہے

لیکن خاں صاحب نے خاموشی اختیار کر لی، دونوں قلم کار ذی علم و ذی احترام، میں نے مدیر "ایوان اردو" کو ایک خط لکھا جو ستمبر ۱۹۹۸ء کے شمارے میں شائع ہوا، خط حسب ذیل ہے:

"ایوان اردو کے تازہ شمارے میں پروفیسر نیر مسعود صاحب کا مراسلہ نما مضمون نظر سے گزرا، نیر صاحب اور رشید حسن خاں صاحب، دونوں میرے کرم فرما ہیں اور دونوں بزرگوں کا

بڑا احترام ان کی علمی خدمات اور ایک خاص ذہنی معیار کے سبب میرے دل میں ہے، لیکن ان
کے مضمون کے تیور دیکھ کر مجھے سخت صدمہ ہوا، ایک معاصر دوسرے معاصر کے لیے کیسے رطب
اللسان ہوتا ہے، اس کا نمونہ نیر صاحب کے تبصرہ فسانۂ عجائب مرتبہ رشید حسن خاں مشمولہ کتاب نما
(دہلی) میں دیکھا تھا اور ایک معاصر اپنے معاصر کے لیے کیسے دل آزار بن جاتا ہے، اس کا یہ
دوسرا نمونہ ہے، ایک ہی قلم سے، بہت مختصر سے وقت کے اندر دو متضاد تحریروں نے مجھے تذبذب
میں ڈال دیا، بڑے لوگوں سے بڑے اخلاق کے مظاہرے کی توقع کی جاتی ہے، میری مودبانہ
گزارش ہے کہ نیر صاحب نے اگر اپنے خیالات پیش کرنے میں عجلت اور جذباتیت سے کام لیا
ہے تو جناب رشید حسن خاں ایسا نہ کریں، اگر اس علم و فضل کے لوگ ایک دوسرے کے لیے ادب
واحترام کی تمام حدیں توڑ دیں گے تو ہم جیسے ادب کے طالب علم کس کو اپنا آئیڈیل بنائیں گے"۔

اسی شمارے میں پروفیسر عبدالحق (دہلی) اور لطیف صدیقی (لکھنؤ) کے مضامین شائع
ہوئے جس میں انہوں نے نیر صاحب کی تحریر کو جذباتی، غیر سنجیدہ اور غیر علمی اسلوب کا حامل بتایا،
دونوں مضمون نگاروں نے یہ تاثر بھی دیا کہ دراصل خاں صاحب کو یوپی اردو اکیڈمی کے آزاد ایوارڈ
ملنے سے لکھنؤ کے بعض حلقے رنجیدہ ہیں اور شاید یہ مضمون اسی رنجیدگی کے آنسوؤں سے لکھا گیا ہے۔

اس سلسلے میں خاں صاحب نے مجھے جو خط لکھا اس کا کچھ حصہ یہاں نقل کر دینا ضروری
سمجھتا ہوں، انہوں نے لکھا:

"میں ۲۷؍ستمبر (۱۹۹۸ء) کو دو ماہ کے بعد واپس آسکا، یہاں آپ کا خط محفوظ تھا،
مطبوعہ خط پہلے ہی پڑھ چکا تھا، اس کا شکریہ، متعدد لوگوں نے مجھ سے نیر صاحب کے لب و لہجے کی
شکایت کی، انہوں نے اپنا ہی نقصان کیا ہے، میرا کچھ نہیں بگڑا، علمی مسائل تبرائی زبان، میں زیر گفتگو
نہیں آسکتے، آپ محمد شاہ رنگیلے کی خرابیوں کو بیان کیجیے کوئی دہلی والا برا نہیں مانے گا، یہ نہیں سمجھے گا
کہ دہلی کی تہذیب کو برا کہا جارہا ہے، اس کے برخلاف لکھنؤ کے کسی مسخرے حکمراں (نصیر الدین حیدر
یا واجد علی شاہ) کی واقعی خرابیوں پر کچھ کہیے، سمجھا جائے گا کہ پورے لکھنؤ، لکھنوی تہذیب اور
پوری شیعہ کمیونٹی پر حملہ کیا گیا ہے، یہ وہی اقلیت کی نفسیات ہے جس میں لسانی یا مذہبی اقلیتیں اکثر
مبتلا رہتی ہیں۔

بہ ہر طور اس کے بعد سے بھی مجھ سے ان سے مراسلت حسب سابق برقرار ہے، ادہر
پرسش احوال کے دو خط یکے بعد دیگرے آئے ہیں، مشیر لکھنوی کی مرثیہ گوئی مشہور ہے، میرے
بھائی نے نثری مرثیہ لکھا ہے، خیر یہ ان کا معاملہ ہے، وہ جانیں، ایوان اردو میں لطیف صدیقی کی تحریر
آپ نے پڑھی ہوگی، ان کا خط بھی میرے پاس آیا تھا، میں نے مزید کچھ لکھنے سے منع کر دیا، غیر علمی
باتیں جس قدر کم ہوں اتنا ہی اچھا ہے، مرحوم سید مسعود حسن رضوی ادیب، مولانا نجم الغنی خاں کو
"تخم الغمی" کہا کرتے تھے، یوں کہ انہوں نے پوست کنندہ حالات لکھے ہیں تاریخ اودھ میں۔

ہاں! کتاب نما کے حالیہ شمارے میں جین صاحب کا تبصرہ مثنویات شوق پر پڑھا، اصلاً
یہ سارا معاملہ اس مولانا آزاد ایوارڈ کا تھا، اکبر حیدری صاحب نے کراچی کے طلوع افکار میں بھی
کچھ گل افشانی فرمائی ہے، انعام کا اعلان ہوتے ہی یہی تحریر انہوں نے قومی آواز میں چھپوائی تھی،
لب لباب یہ تھا کہ بڑے غیر مستحق شخص کو اب کے یہ انعام دیا گیا ہے، انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ
وہ روزانہ نیر مسعود صاحب کے یہاں جاتے ہیں، خیر حیدری صاحب کو میں غیر مکلف مانتا ہوں
بہ لحاظ تحقیق، یوں وہ کیا اور ان کی بات کیا"۔ (خط مکتوبہ ۴؍اکتوبر ۱۹۹۸ء)

سطور بالا میں جو کچھ مذکور ہوا اس کا تعلق یا تو فون پر کی گئی گفتگو سے ہے یا نصف ملاقات
یعنی مراسلت سے، ان سے بالمشافہ ملاقاتیں بہت کم ہوئیں، باوجود اس ذہنی قربت، ہم خیالی اور
محبت کے ملاقات کے مواقع بہت کم حاصل ہوئے، ایک خط میں اس بات کو انہوں نے کس
خوب صورت پیرائے میں لکھا ہے:

"بریلی آنا نہیں ہو پاتا، یوں کہ بہت قریب ہے، قربت کے یہ کرشمے اکثر دیکھنے میں
آتے رہتے ہیں، آدمی اپنے سے قریب بھی اسی لیے نہیں ہو پاتا کہ وہ اپنے سے دور نہیں ہوتا،
اسی لیے تصوف میں عرفان ذات پر بہت زور دیا گیا ہے، بہ ہر صورت کبھی تو توفیق رفیق ہوگی"۔
(خط مکتوبہ ۱۴؍اگست ۱۹۹۶ء)

خاں صاحب سے پہلی ملاقات دسمبر ۱۹۹۵ء میں غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی میں سہ روزہ
سمینار (۲۲، ۲۳، ۲۴ دسمبر) کے دوران ہوئی، اس ملاقات میں انہوں نے محبت و شفقت کے
جتنے جام تھے سبھی لنڈھا دیے، انہوں نے سمینار میں مجھے خود سے علاحدہ نہیں ہونے دیا، دوپہر کا

کھانا بھی ساتھ ہی کھایا، میں مرغ و بریانی کے مزے لے رہا تھا، انہوں نے محض سبزیوں کے سلاد پر قناعت کر لی تھی، سمینار کے مختلف اجلاسوں میں بھی وہ مجھے اپنے پاس بیٹھنے کی تاکید کرتے رہے، گفتگو کے دوران وہ میری ذہنی سطح، مطالعے اور مشاہدے، مزاج و نفسیات کو ماہرانہ انداز میں جانچتے اور آنکتے رہے، انہوں نے متعدد علمی موضوعات پر گفتگو کی، اس وقت وہ دہلی یونی ورسٹی کے گوائر ہال میں رہتے تھے، سمینار کے اجلاسوں میں وہ شریک ہوتے اور شام کو واپس چلے جاتے۔

۲ر فروری ۱۹۹۶ء کو وہ تمام اسباب لے کر دہلی سے شاہ جہاں پور آ گئے اور یہیں انہوں نے اپنے گھر پر لکھنے پڑھنے کی بساط بچھا دی، اس دوران ان سے مراسلت کا سلسلہ جاری رہا۔

۷ر اکتوبر ۱۹۹۷ء کو میں ملاقات کے لیے شاہ جہاں پور ان کے دولت کدے پر حاضر ہوا، بہت خوش ہوئے اور بڑی تواضع کی، چلتے وقت تین کتابیں نذر کیں، مثنوی زہر عشق جدید تحقیق و تبصرہ کی روشنی میں از عشرت رحمانی، مقالات صدیقی (ج ۱) از عبدالستار صدیقی اور نجوم الفرقان فی اطراف القرآن، موخر الذکر کتاب قرآن کریم کے الفاظ کا اشاریہ ہے جو ۱۸۹۸ء کا مطبوعہ ہے۔

خاں صاحب کا گھر سادہ سا بنا ہوا تھا، جس کمرے میں میں بیٹھا تھا، اس کی نوعیت ڈرائنگ روم کم ریڈنگ روم کی سی تھی، چاروں طرف کتابیں سلیقے کے ساتھ لگی ہوئی تھیں، سینٹر ٹیبل کے پاس ہی کسی چھوٹی ٹیبل یا اسٹول پر ادبی رسائل سلیقے سے رکھے ہوئے تھے، کمرے میں ایک طرف ایک ریڈنگ ٹیبل بھی تھی جو ضخیم لغات کی جلدوں سے لدی ہوئی تھی، اسی ٹیبل پر پین اسٹینڈ میں بہت سے پین اور داہنی طرف ایک ٹیپ ریکارڈر اور بہت سے کیسٹ رکھے ہوئے تھے، میں نے بڑی حیرت اور استعجاب سے پوچھا جناب ٹیبل پر ٹیپ ریکارڈر کا موجود ہونا آپ کا اس سے غیر معمولی شغف ظاہر کرتا ہے، کہنے لگے ہاں بھئی لکھتے پڑھتے وقت ہلکی میوزک سننے کا عادی ہوں، اس سے تکان نہیں ہوتا، میں نے کہا میوزک آپ کے مطالعے یا تحریر میں خلل انداز نہیں ہوتی، کہنے لگے بالکل نہیں یہ میری عادت ہے۔

۱۹۹۷ء میں ایک مرتبہ پھر غالب انسٹی ٹیوٹ کے سمینار میں ملاقات ہوئی، اس مرتبہ وہ شاہجہاں پور سے دہلی تشریف لے گئے تھے، ایک اجلاس میں ان کی صدارت اور میری نظامت تھی، اجلاس کے اختتام کے بعد انہوں نے مجھ سے کہا، آپ نے نظامت اچھی کی، الفاظ کی ادائیگی

ٹھیک تھی مگر ایک لفظ کا تلفظ وہ نہیں ہے جو آپ نے ادا کیا، بھائی صحت تلفظ کا بھی خیال رکھیے۔

جولائی ۱۹۹۸ء میں رضا لائبریری رام پور کے سمینار میں بھر پور ملاقات ہوئی، اسی ملاقات میں یہ طے پایا کہ ماہ بہ ماہ ایک نشست بریلی میں رکھی جائے اور خاں صاحب اس میں بہ طور خاص شریک ہوں، چنانچہ وہ میری دعوت پر ۸ر نومبر ۱۹۹۸ء کو بریلی تشریف لائے اور میرے غریب خانے پر دن گزار کر شام کو شاہجہاں پور کے لیے واپس ہو گئے، اس موقع پر وہ میرے لیے اپنی تین تصانیف بھی لائے تھے، میں نے ان کی ذہنی ضیافت کے لیے چند مقامی ادیبوں ڈاکٹر لطیف حسین ادیب، محمد عرفان، ڈاکٹر مصطفیٰ حسین نظامی، قنبر سعید اور چند اردو دوستوں کو مدعو کر لیا تھا، اچھی نشست رہی، تقریباً دو گھنٹے کی اس نشست میں املا، تلفظ اور زبان کے بہت سے مسائل زیر گفتگو آئے، رشید صاحب کی گل افشانیٔ گفتار دیکھنے کی تھی۔

ان سے جب سے تعلق قائم ہوا تب سے انہوں نے اپنی ہر نئی کتاب دستخط کر کے مجھے ضرور بھیجی اور میری حقیر رائے جاننے کے بھی خواہش مند رہے، میں نے ان کی دو کتابوں "مثنویات شوق" اور "زٹل نامہ" پر تبصرہ لکھے جو بالترتیب ہماری زبان دہلی (اگست تا اکتوبر ۱۹۹۸ء) اور شاعر ممبئی (نومبر ۲۰۰۱ء) میں شائع ہوئے، اول الذکر تبصرے کو انہوں نے پسند فرمایا اور جی بھر کر دعائیں دیں لیکن دوسرے تبصرے کو پڑھ کر وہ کچھ کبیدہ خاطر ہو گئے اور کچھ دن فون پر ہاں ٹھیک ہوں تک گفتگو محدود رہی، پھر وہ گفتگو بھی بند ہو گئی، اس تبصرے میں میرے درج کردہ تسامحات ان کی رنجیدگی کا باعث نہیں تھے بلکہ رنجیدگی کا باعث وہ عبارت تھی جس میں میں نے لکھا تھا کہ رشید صاحب نے طویل بیماری کے سبب یہ کام بہت عجلت میں کیا ہے اور ان کے دوسرے تدوینی کاموں سے یہ فروتر ہے۔

آخر آٹھ نو ماہ بعد ان کا فون آیا، شمس صاحب میں رشید حسن خاں بول رہا ہوں، آپ تو اسلام کی نشاۃ ثانیہ پر ایمان رکھتے ہیں، سچ سچ بتائیے آپ مجھ سے ناراض کیوں ہے؟ میں نے کہا قبلہ میں آپ سے ناراض ہونے کی جسارت کیسے کر سکتا ہوں، آپ تو میرے بزرگ ہیں، محسن ہیں، کہنے لگے دیکھیے منافقانہ باتیں نہ کیجیے، سچ سچ بتائیے آپ اب فون کیوں نہیں کرتے؟ میں نے کہا جانے بھی دیجیے

میری ان کی کوئی لڑائی ہے اب چلا جاؤں اب صفائی ہے

کہنے لگے خیر جانے دیا لیکن رابطہ ضرور رکھیے، میرے دل میں آپ کی بڑی قدر ہے، دل کے معاملات تھوڑے، بہت آپ بھی جانتے ہی ہوں گے؟ آج کل کیا لکھ رہے ہیں؟

(۲)

رشید حسن خاں کی حیات، شخصیت اور تحقیقی وتنقیدی کام ہر طرح کے پیشہ ورانہ تصور سے خالی تھا، انہوں نے تحقیق کے جو پیمانے بنائے تھے، ان پر سود وزیاں سے بالا ہو کر تحقیقی کام نہایت تحمل اور صبر وضبط کے ساتھ کرتے رہے، انہوں نے جو کام بھی کیا ہے، وہ ہماری تاریخ ادب کا زریں باب ہے، سطور ذیل میں ان کی حیات وخدمات کا مختصر تعارف پیش کیا جارہا ہے:

اضلاع روہیل کھنڈ میں شاہجہاں پور، بریلی اور رام پور میں پٹھانوں کے خیل (گروہ) کثرت سے آباد ہوئے، اٹھارہویں اور انیسویں صدی عیسوی میں روہیلوں کے عروج اور ان کی ریاست کے قیام کے زمانے میں افغانستان اور صوبہ سرحد سے کافی تعداد میں پٹھان ان علاقوں میں وارد ہوئے اور یہیں بس گئے، رشید حسن خاں بھی بہ قول ان کے بیٹے خورشید حسن خاں ''نسباً یوسف زئی تھے اور اپنے طور وطریق سے مکمل پٹھان تھے، وہ پٹھانوں کی فطرت سے بہ خوبی آشنا تھے جس کا ذکر بھی نہایت دل چسپی سے کرتے تھے، ان کے والد کا نام امیر حسن خاں تھا جو محکمہ پولس میں داروغہ تھے، انگریزوں اور انگریزی تعلیم کو برا سمجھتے تھے، انہوں نے تحریک عدم تعاون کے زمانے میں نوکری سے استعفیٰ دے دیا تھا۔

خاں صاحب کی تاریخ پیدائش از روئے تعلیمی اسناد ۱۰ر جنوری ۱۹۳۰ تحریر کی گئی ہے (رشید حسن خاں اطہر فاروقی، دہلی ۲۰۰۲، ص ۹) جو غلط معلوم ہوتی ہے کیوں کہ ۱۹۳۹ء میں انہوں نے شاہجہاں پور کی آرڈی نینس فیکٹری میں ملازمت کا آغاز کیا تھا، ظاہر ہے ۹ سال کی عمر میں تو ان کو ملازم نہیں رکھا گیا ہوگا۔

خاں صاحب یکم اگست ۱۹۹۸ کو ممبئی علاج کے لیے گئے تھے، اسی زمانے میں روزنامہ انقلاب ممبئی کے لیے ڈاکٹر صاحب علی نے ان سے انٹرویو لیا تھا، اس انٹرویو (مطبوعہ ۱۳ر اکتوبر ۱۹۹۸ء) میں خاں صاحب کے تعارف میں ادارے کی طرف سے جو نوٹ دیا گیا ہے، اس میں خاں صاحب کی تاریخ پیدائش دسمبر ۱۹۲۵ء دی گئی ہے، اخبار کا تراشہ خاں صاحب نے خود مجھے

بھیجا تھا، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اخبار میں شائع کردہ تاریخ خاں صاحب کی فراہم کردہ تھی، اگر یہ غلط ہوتی تو خاں صاحب اس کو قلم زد کرتے یا اس سے مطلع کرتے، لہذا یہ طے ہے کہ ان کی صحیح تاریخ پیدائش دسمبر ۱۹۲۵ ہی ہے، اس سال پیدائش سے ان کی ملازمت کے آغاز کا سنہ بھی درست قرار پاجاتا ہے، یعنی وہ بہ وقت ملازمت ۱۴ سال کے تھے۔(۱)

خاں صاحب کی تعلیم کو بھی باضابطہ نہیں کہا جاسکتا، ان کا داخلہ شاہجہاں پور کے عربی مدرسے بحر العلوم میں کرایا گیا تھا لیکن وہ درس نظامی مکمل نہیں کرسکے اور معاشی حالات اچھے نہ ہونے کی وجہ سے ملازمت پر مجبور ہوئے، انہوں نے پرائیویٹ طور پر اردو، عربی، فارسی کے امتحانات پاس کیے، لکھنؤ یونی ورسٹی سے دبیر کامل اور الہ آباد بورڈ سے مولوی کا امتحان پاس کیا اور کثرت مطالعہ سے اپنے علم میں برابر اضافہ کرتے رہے، باضابطہ یونی ورسٹی ایجوکیشن سے محروم رہے، ۱۹۴۷ء میں آرڈی نینس فیکٹری کی ملازمت سے برطرف کردیے گئے، ملازمت سے برطرف کیے جانے کا سبب خاں صاحب کا مزدور یونین بنانے میں حصہ لینا اور اس یونین میں جوائنٹ سکریٹری کا عہدہ قبول کرنا تھا، اس فیکٹری میں تیس ہزار سے زائد آدمی کام کرتے تھے۔

ملازمت سے برطرف ہوجانے کے بعد بالترتیب مدرسہ فیض عام اور اسلامیہ ہائر سیکنڈری اسکول شاہجہاں پور میں مدرس مقرر ہوئے (۲)، اگست ۱۹۵۹ء میں شعبہ اردو دہلی یونی ورسٹی میں ریسرچ اسسٹنٹ کے طور پر ان کا تقرر ہوا، یہ تقرر عارضی تھا، ۱۹۶۴ء میں اسے کل وقتی منظوری حاصل ہوگئی، تقریباً تیس سال ملازمت کرنے کے بعد ۳۱ر دسمبر ۱۹۸۹ء کو وہ اسی عہدے سے سبکدوش ہوئے۔

سبکدوش ہونے کے بعد ایک مدت تک وہ یہ فیصلہ نہیں کرسکے کہ انہیں دہلی میں رہنا چاہیے یا واپس اپنے وطن لوٹ جانا چاہیے، آخر ۲ر فروری ۱۹۹۶ کو وہ دہلی سے مستقل طور پر شاہجہاں پور آگئے اور لکھنے پڑھنے کے مشاغل میں مصروف ہوگئے، چند سال پیشتر ان کو ذیابطیس

---

(۱) ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب نے راقم کو خاں صاحب کی وفات کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا تھا ''مجھ سے چار چھ سال بڑے تھے، عمر ۸۲-۸۴ برس کی ہوگی'' (مکتوب ۲۸ر فروری ۲۰۰۶ء) (۲) ادیب صاحب کے محولہ مکتوب گرامی میں یہ بھی تحریر ہے کہ ''میں ان کو اس وقت سے جانتا تھا جب کہ وہ اپنی نوجوانی کے ایام میں بریلی میں مقیم تھے'' (بنام ضیاء الدین)

کا مرض لاحق ہوگیا تھا جس کے زیر اثر انجائنا کا شکار ہوئے، ادبی کام اس حال میں بھی جاری رکھا، سمیناروں میں شرکت بند کردی تھی، متقاعد زندگی گزار رہے تھے۔

مارچ ۲۰۰۳ء میں ان کی اہلیہ نے وفات پائی، اس صدمہ کا انہوں نے کسی سے ذکر بھی نہیں کیا، بالآخر ۲۶رفروری ۲۰۰۶ء کو ان کا بھی وقت موعود آپہنچا، پس ماندگان میں انہوں نے دو بیٹے خورشید حسن خاں، خالد حسن خاں اور بیٹی نادرہ بیگم زوجہ مقصود حسن خاں یادگار چھوڑیں، خاں صاحب کے دونوں بیٹے اردو ٹیچر ہیں۔

خاں صاحب نے ایک محتاط اندازے کے مطابق تقریباً ۴۳ کتابیں لکھیں، ۱۳ کتابیں مکتبہ جامعہ کے لیے تیار کیں جن میں سے چند دستیاب نہیں ہوسکیں، مطبوعہ کتب کے اسماع سنین و مقام اشاعت حسب ذیل ہیں:

مقدمہ شعر و شاعری (دہلی ۱۹۶۹) انتخاب نظیر اکبرآبادی (دہلی ۱۹۷۰) انتخاب شبلی (دہلی ۱۹۷۱) انتخاب مراثی انیس و دبیر (دہلی ۱۹۷۱) دیوان خواجہ میر درد (دہلی ۱۹۷۱) انتخاب سودا (دہلی ۱۹۷۲) انتخاب کلام ناسخ (دہلی ۱۹۷۲-کراچی ۱۹۹۶) اردو املا (دہلی ۱۹۷۴) اردو کیسے لکھیں (دہلی ۱۹۷۵) زبان اور قواعد (دہلی ۱۹۷۶، ۱۹۸۳) ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ (دہلی ۱۹۷۸، لکھنؤ، لاہور ۱۹۸۹) تلاش و تعبیر (دہلی ۱۹۸۸) فسانہ عجائب (دہلی ۱۹۹۰، لاہور ۱۹۹۰، دہلی ۱۹۹۶) باغ و بہار (دہلی ۱۹۹۲، لاہور ۱۹۹۲) تفہیم (دہلی ۱۹۹۳) انشاء اور تلفظ (دہلی ۱۹۹۴) عبارت کیسے لکھیں (دہلی ۱۹۹۴) انشائے غالب (دہلی ۱۹۹۴، کراچی ۲۰۰۱) مثنوی گلزار نسیم (دہلی ۱۹۹۵) مثنویات شوق (دہلی ۱۹۹۸، کراچی ۱۹۹۸) تدوین تحقیق، روایت (دہلی ۱۹۹۹) املائے غالب (دہلی ۲۰۰۰) مثنوی سحر البیان (دہلی ۲۰۰۰) مصطلحات ٹھگی (دہلی ۲۰۰۲) زٹل نامہ (دہلی ۲۰۰۳) کلاسیکی ادب کی فرہنگ ج ۱ (دہلی ۲۰۰۳)۔

ان کا آخری تدوینی کام لفظیات غالب ہے، جسے انہوں نے ''گنجینۂ معنی کا طلسم'' نام دیا ہے، یہ دو جلدوں پر مشتمل ہوگا، تقریباً ۱۵۰۰ صفحات پر، غالب کے اردو کلام میں مستعمل الفاظ کی نوعیت استعمال پر بحث کی گئی ہے، جلد اول جس کی کتابت ہوچکی ہے، جلد ہی انجمن ترقی اردو ہند شائع کرے گی۔

تین کتابیں غرائب اللغات، امراؤ جان ادا اور قصائد سودا کی تدوین بھی ان کے پیش

نظر تھی، اس سلسلے کا مواد وہ برابر اکٹھا کر رہے تھے لیکن ان پر کام کرنے کی نوبت نہیں آسکی۔

خاں صاحب کے پسندیدہ موضوع ادبی تحقیق اور تدوین رہے ہیں لیکن ادب میں ان کا اختصاص ادبی تحقیق اور تدوین متن کے ساتھ ساتھ املا، لغت، زبان و قواعد کے مسائل اور عروض بھی رہے ہیں، ان کی جملہ تصانیف ان موضوعات میں سے کسی نہ کسی کا احاطہ کرتی نظر آتی ہیں۔

خاں صاحب نے ہند و پاک کی مختلف جامعات میں اصول تحقیق و تدوین اور مشرقی شعریات پر تقریباً دو درجن لکچر دیے، املا پر متعدد ورکشاپ کنڈکٹ کیں، شعبہ اردو جموں یونی ورسٹی اور شعبہ اردو بمبئی یونی ورسٹی میں بہ حیثیت وزیٹنگ فیلو متعینہ مدت میں لکچر دیے۔

خاں صاحب کو ملک اور بیرون ملک کے تقریباً ایک درجن انعامات و اعزازات سے نوازا گیا، مثلاً دہلی ساہتیہ کلا پریشد ایوارڈ ۱۹۷۷، غالب ایوارڈ ۱۹۷۹، نیاز فتح پوری ایوارڈ (کراچی) ۱۹۸۹، محمد طفیل ادبی ایوارڈ (لاہور) ۱۹۹۰، کل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ ۱۹۹۱، ابوالکلام آزاد ایوارڈ ۱۹۹۷۔

میری نظر میں ان کو اب تک کا سب سے بڑا اعزاز و اکرام انجمن ترقی اردو ہند دہلی نے دیا تھا، انجمن کی نشر و اشاعت کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ خاں صاحب کی کسی بھی کتاب کے مسودے کو اشاعت کی منظوری حاصل کرنے کے لیے کمیٹی کے سامنے نہ رکھا جائے بلکہ مسودہ موصول ہوتے ہی بغیر کسی تاخیر کے شائع کردیا جائے، انجمن کی تاریخ کا شاید یہ سب سے انوکھا فیصلہ تھا جو ہر لحاظ سے مفید مطلب ثابت ہوا، ایک مصنف کی کتاب اگر اشاعت سے محروم رہے یا اس کی اشاعت میں توقف یا التوا پیدا ہوجائے تو اس کے آیندہ کے تصنیفی منصوبے متاثر ہوجاتے ہیں، خاں صاحب اس معنی میں خوش نصیب مصنف تھے کہ ان کی ہر نئی کتاب تصنیف و تکمیل کے دوران ہی اشاعت کے مراحل طے کرنے لگتی تھی، خاں صاحب کو اشاعت کے مراحل سے بے نیاز کرنے اور ان کے خاص اختیار کردہ املا، توقیف نگاری، اعراب نگاری کو برقرار رکھنے کی انجمن نے جو مثال قائم کی، اس کے لیے وہ تمام اردو حلقے کے شکریے کی مستحق ہے، دو مصرعوں پر میں اپنی بات کو ختم کرتا ہوں:

تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائی خیال کہاں

☆☆☆

مطبوعات جدیدہ

سنگم (سہ لسانی لغت): مرتبہ جناب مولانا حکیم عزیز الرحمن اعظمی، بڑی تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات جلد اول ۷۸۷، جلد دوم ۸۸۸، جلد سوم ۶۰۳، قیمت ہر جلد ۲۰۰ روپے، پتہ: مکتبہ فردوس، مکارم نگر، برولیا ٹیگور مارگ، لکھنؤ۔

تعلیم وتدریس، تصنیف وتحقیق، ترجمہ وتالیف اور وعظ وتبلیغ کے ساتھ طب وادب کا بیک وقت اجتماع خوش نصیبوں کے حصے میں آتا ہے، علمائے متقدمین میں جس کثرت سے اس کی مثالیں ملتی ہیں اب یہ اتنی ہی شاذ ہیں، زیر نظر لغت کے مرتب یقیناً ایک استثنائی شخصیت ہیں جن کے قلم سے دو درجن سے زیادہ متنوع کتابیں نکل چکی ہیں، بعض کا ذکر ان سطروں میں بھی آچکا ہے، مسلسل محنت، عرق ریزی اور جاں کاہی ان کی عادت ثانیہ ہے، پیرانہ سالی، عوارض کی کثرت اور صحت کی نادرستی کے باوجود ان کا علمی انہماک غیر معمولی ہی کہا جائے گا اور اس کی تازہ مثال زیر نظر سہ لسانی لغت ہے جس میں انہوں نے انگریزی الفاظ کے عربی اور اردو ترجمے کا التزام کیا اور جو کام ایک جماعت کے کرنے کا تھا اس کو انہوں نے تن تنہا انجام دیا، عربی زبان پر ان کا عبور تو مسلم ہے بقول مدیر معارف "عربی کی جو اچھی کتاب ہاتھ لگتی ہے اس کا ترجمہ کر کے ہی دم لیتے ہیں، طبع زاد معلوم ہونے والے ان ترجموں میں بڑی روانی، برجستگی اور شگفتگی ہوتی ہے"، لیکن انگریزی زبان میں بھی ان کی یہ مہارت اور استعداد کی پختگی واقعی حیرت انگیز ہے اور اس سے بھی زیادہ ان کی ہمت اور حوصلہ قابل داد ہے، انگریزی، عربی اور اردو کا یہ سنگم واقعی مبارک اور دلکش ہے، ترجمہ کی خوبی کی اصل قدر تو اس فن کے ماہرین ہی کر سکتے ہیں، ہماری نظر میں یہ سلیس اور عام فہم ہی ہے، البتہ اردو میں بعض مترادف الفاظ میں نامانوس لفظ بھی آگئے ہیں، مثلاً ACCIDENTAL کے ترجمہ میں لفظ صادفاتی بھی ہے اور یہ بھی سہو کتابت سے صادتاتی ہو گیا ہے ACCLIMATE کے ترجمہ میں حیواناشنیاتات کا لفظ بھی وضاحت طلب ہے، ACCOMMODATION کے متعدد معانی میں پسنجر ٹرین کی جگہ محض ٹرین یا لوکل ٹرین شاید زیادہ مناسب ہوتا، ACCOMPANIMENT کا ترجمہ بحر کالی بھی عام فہم نہیں، کمپیوٹر کی کتابت میں بھی خاصی غلطیاں ہیں، اردو میں بھی اور اصل انگریزی میں بھی، آیندہ اڈیشن زیادہ توجہ کا مستحق ہے، شروع میں مولانا ضیاء الدین اصلاحی اور مولانا واضح رشید ندوی کی اور خود فاضل مرتب کی تحریریں بھی ہیں۔

ع۔ص

دارالمصنفین کا سلسلہ تاریخ ہند

		Pages	Rs
۱۔ مقدمہ رقعات عالمگیر	سید نجیب اشرف ندوی	492	80/-
۲۔ بزم تیموریہ اول	سید صباح الدین عبدالرحمن	605	150/-
۳۔ بزم تیموریہ دوم	سید صباح الدین عبدالرحمن	266	50/-
۴۔ بزم تیموریہ سوم	سید صباح الدین عبدالرحمن	276	56/-
۵۔ بزم صوفیہ	سید صباح الدین عبدالرحمن	746	140/-
۶۔ ہندوستان کے عہد وسطی کی ایک ایک جھلک	سید صباح الدین عبدالرحمن	524	80/-
۷۔ مختصر تاریخ ہند	سید ابوظفر ندوی	194	50/-
۸۔ ہندوستان کی کہانی	عبدالسلام قدوائی ندوی	70	20/-
۹۔ تاریخ سندھ	سید ابوظفر ندوی	420	56/-
۱۰۔ ہندوستان عربوں کی نظر میں اول	ضیاء الدین اصلاحی	410	75/-
۱۱۔ ہندوستان عربوں کی نظر میں دوم (جدید اڈیشن)	ضیاء الدین اصلاحی	358	125/-
۱۲۔ گجرات کی تمدنی تاریخ	ابوظفر ندوی		
۱۳۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے	سید صباح الدین عبدالرحمن	648	80/-
۱۴۔ بزم مملوکیہ	سید صباح الدین عبدالرحمن	370	70/-
۱۵۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے	ادارہ	354	50/-
۱۶۔ ہندوستان کے سلاطین علماء ومشائخ کے تعلقات پر ایک نظر	مرتبہ: سید صباح الدین عبدالرحمن	238	75/-
۱۷۔ کشمیر سلاطین کے عہد میں	ترجمہ: علی حماد عباسی	468	56/-
۱۸۔ ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں	سید صباح الدین عبدالرحمن	134	30/-
۱۹۔ ہندوستان کی بزم رفتہ کی سچی کہانیاں اول	سید صباح الدین عبدالرحمن	252	50/-
۲۰۔ ہندوستان کی بزم رفتہ کی سچی کہانیاں دوم	سید صباح الدین عبدالرحمن	180	30/-
۲۔ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں	ابوالحسنات ندوی	132	25/-
۲۱۔ عرب وہند کے تعلقات	سید سلیمان ندوی	442	95/-